FICTION HOUSE
رزم گاہِ حیات
(کہانیاں)
شہزاد اسلم
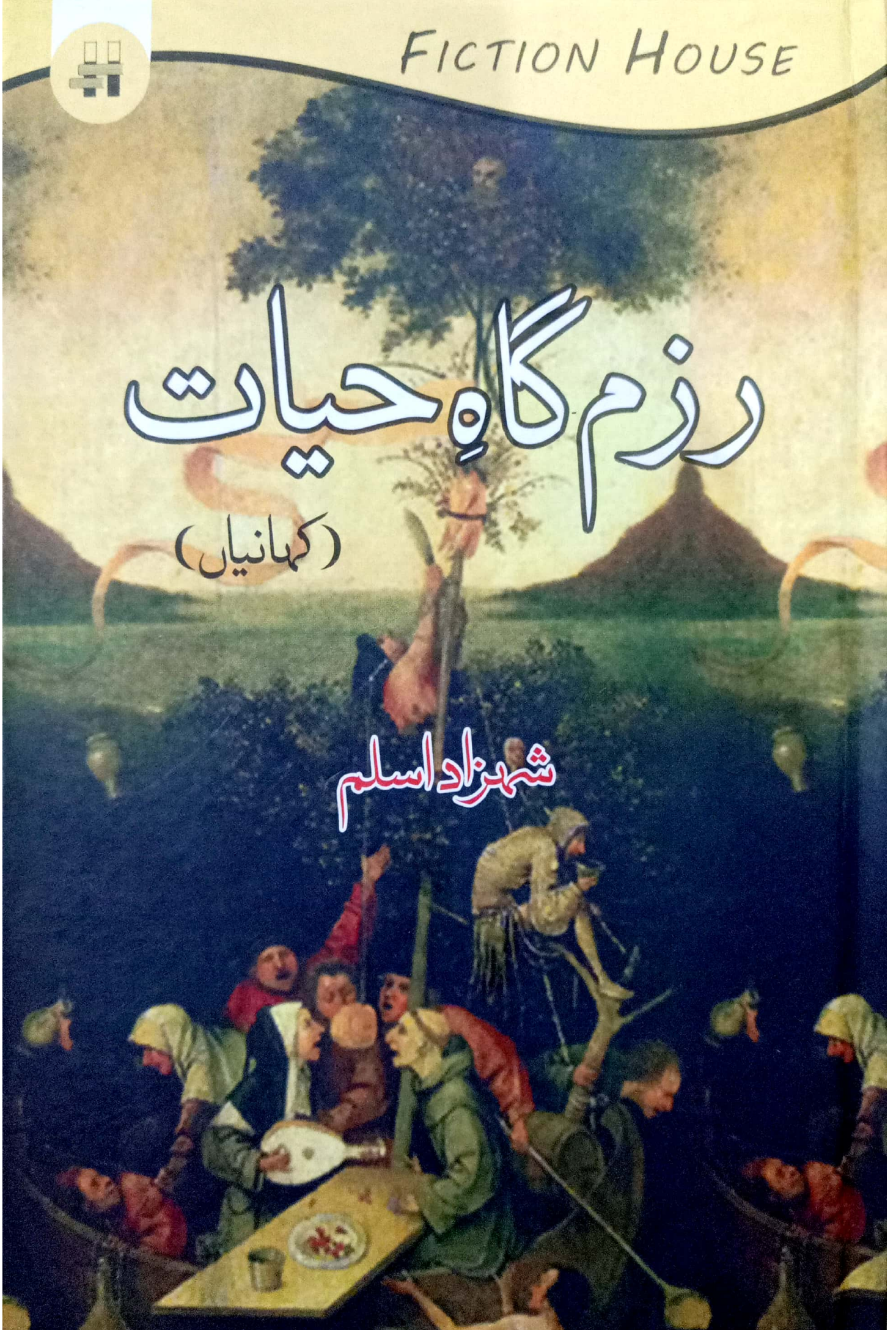
رزم گاہِ حیات

(کہانیاں)

شہزاد اسلم

فکشن ہاؤس
○لاہور ○کراچی ○حیدرآباد
e-mail: fictionhouse1991@gmail.com

مصنف کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں
کتاب کی کمپوزنگ طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری احتیاط کی جاتی ہے۔ بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی رہ گئی ہو یا متن درست نہ ہو تو ازراہ کرم مطلع فرمائیں۔ تاکہ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کیا جائے۔ (ناشر)

نام کتاب	:	رزم گاہِ حیات (کہانیاں)
مصنف	:	شہزاد اسلم
اہتمام	:	ظہور احمد خاں
پبلشرز	:	فکشن ہاوس، لاہور
کمپوزنگ	:	فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور
پرنٹرز	:	سید محمد شاہ پرنٹرز، لاہور
سرورق		ریاض ظہور
اشاعت		2019ء
قیمت	:	-/300 روپے

تقسیم کار:
فکشن ہاؤس: بک سٹریٹ 68-مزنگ روڈ لاہور، فون: 042-36307550-1,37249218
فکشن ہاؤس: 52,53 رابعہ سکوائر حیدر چوک حیدر آباد، فون: 022-2780608
فکشن ہاؤس: نوشین سنٹر، فرسٹ فلور دوکان نمبر 5 اردو بازار کراچی، فون: 021-32603056

لاہور ○ کراچی ○ حیدرآباد
e-mail: fictionhouse2004@hotmail.com

انتساب

اُن عام انسانوں

کے نام

جو جینے کے لیے عمر بھر مرتے رہتے ہیں

لیکن کہانیوں میں ہمیشہ زندہ رہتے ہیں

فہرست

تعارف

فکشن زندگی کے رموز کی تلاش میں سرگرداں ہے اور اس عمل میں وہ زندگی تبدیل بھی کرتی ہے اور خود حقیقت بھی بن جاتی ہے۔ ادب پڑھنا خالص خوشی ہے اور لکھنا اُس خوشی کی مسکراہٹ ہے۔ لکھنے کا میرا پہلا تجربہ ہے اور میرا تاثر یہی رہا کہ خیال کا اثر الفاظ میں ڈھلنے سے پہلے ہی کافی حد تک زائل ہو جاتا ہے اور ادھورا خیال ہی لڑکھڑاتے ہوئے ناچتا نظر آتا ہے۔ لفظوں کا یہ ناچ پڑھنے والوں کو کیسے لگے گا، میں نہیں جانتا۔ میں ٹیپو سلمان مخدوم صاحب کا شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے لکھنے کی طرف راغب کیا اور اُن کی حوصلہ افزائی اور کوشش سے میری کہانیاں چھپ سکی ہیں۔

ووٹ

جارج مسیح کی عمر 50 سال ہے اور وہ پچھلے 42 سال سے مزدوری کر رہا ہے۔اس کے چھ بچے ہیں۔وہ سنت نگر گاؤں میں ہی پیدا ہوا۔وہ اپنے باپ دادا کے پیشہ سے وابستہ ہے۔اپنی جوانی تو اس نے باپ کے حصے کا قرض اتارنے میں گزار دی۔وراثت میں گویا یہی قرض ملا تھا جس کو کئی ناگہانی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں نے ایک بڑا دیو بنا دیا تھا جو ہر وقت اس کو ڈرانے کے لئے موجود رہتا تھا۔گاؤں کے آدھے سے زیادہ زمینداروں کی زمینوں پر وہ کام کر چکا تھا۔اس کے چار بیٹوں میں ہر ایک نے اس عمر میں ہی باپ کا ہاتھ بٹانے کے لئے کام شروع کر دیا تھا جب مسلمان کے بچے پر نماز فرض ہو جاتی ہے۔جارج مسیح کے لئے کام ہی عبادت تھی۔ اس کی بیوی اور دو بیٹیاں مسلمان گھروں میں کام کرتی تھیں۔عیسائیوں کی ایک چھوٹی سے بستی تھی جو کہ تقریباً پندرہ سولہ گھروں پر مشتمل تھی۔گاؤں اور بستی کے درمیان ایک جوہڑ تھا جو بستی اور گاؤں کو ایک دوسرے سے الگ کرتا تھا۔بستی کی افرادی قوت، گھر کی بنی شراب اور لڑکوں کو لبھانے کے لئے نوجوان لڑکیاں گاؤں کے لئے شریانوں میں چلنے والے خون کی مانند تھیں البتہ گاؤں کا سارا گندہ پانی بستی کی طرف ایسے جاتا جیسے وہاں کوئی مقناطیسی قوت ہو جو کہ غلاظت کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔آج صبح ہوتے ہی جارج مسیح اپنے مالک رانا اورنگزیب کے فارم کی طرف چل نکلا۔اس کا ہمسایہ

ریاست مسیح بھی اس کے ساتھ تھا۔دونوں گپ شپ کرتے اور اپنی اپنی ضرورتوں اور مسائل کا احاطہ کرتے ہوئے جا رہے تھے کہ ریاست مسیح نے جارج مسیح سے کہا کہ تم شہر کیوں نہیں چلے جاتے ، وہاں تو کام کا معاوضہ بھی زیادہ ہے۔جارج مسیح نے جواب دیا کہ بھلا میں کیسے جا سکتا ہوں۔چوہدری اورنگزیب کا ابھی اتنا قرضہ بھی تو ادا کرنا ہے، وہ ادا کیے بغیر کیسے جا سکتا ہوں۔ریاست مسیح اسے رضامند کرنے کے لئے یہ کہتا ہے کہ دیکھو گاؤں کے موچی، کمہار، نائی تو شہر چلے گئے ہیں اور سب اپنے اپنے پیشے سے منسلک کاروبار میں لگے ہیں اور ان کے تو گویا دن بدل گئے ہیں۔جارج مسیح نے پھر مایوسی سے لبریز آواز میں جواب دیا کہ ان کے پیشے میں تو ترقی کے مواقع ہیں۔لیکن ہم تو یہاں جانوروں کا گوبر اٹھاتے ہیں وہاں شہر میں انسانوں کی گندگی صاف کریں گے۔ہم جہاں بھی جائیں ہمارے لیے تو صرف یہی کام ہے۔جارج مسیح کا یہ جواب سن کر ریاست مسیح کے دل کی خواہش بھی مر گئی اور اس نے بھی شہر جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔دونوں نے اپنے اپنے فارم کا رخ کیا۔جارج مسیح شام کو تمام کام کر کے واپس گھر آ گیا۔انہی دنوں حکومت نے روشن خیال اعتدال پسندی کے تحت اقلیتوں کو منٹو مارلے اصلاحات کی طرز پر جداگانہ حقوق دینے کی خاطر دو طرح کے ووٹنگ کے حق دیئے۔اقلیتی برادری نہ صرف اپنے علیحدہ نمائندے چن سکتی تھی بلکہ مسلمان نمائندوں کو بھی بطور عام شہری ووٹ دے سکتے تھے۔ان دنوں دیہی حکومتوں کے لئے الیکشن کا اعلان ہو چکا تھا۔رانا اورنگزیب کی برادری کے ہی رانا ناصر نے یونین کونسل کے ناظم کے الیکشن کے لئے کاغذات نامزدگی جمع کروائے تھے۔جبکہ دوسری طرف جٹوں کی برادری سے چوہدری انصر کھڑے تھے۔دونوں میں کانٹے دار مقابلہ تھا۔رانا اور جٹ برادریاں اپنا اپنا اثر ورسوخ استعمال کر رہی تھیں۔ گاؤں کی چھوٹی برادریاں اور عیسائیوں کے ووٹ اس الیکشن میں فیصلہ کن اہمیت

اختیار کر گئے تھے۔ الیکشن سے کوئی ایک ہفتہ قبل رانا ناصر اور رانا اورنگزیب چند دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ رات کو جارج مسیح کے گھر پہنچ گئے۔ جارج مسیح کا گھر دو کچے کمروں اور چھوٹے صحن پر مشتمل تھا۔ جاج مسیح اور اس کے بیٹوں نے جلدی سے چارپائیاں صحن میں بچھا دیں۔ رانا ناصر نے جارج مسیح کے بچوں اور زندگی کے باقی معاملات کا حال احوال پوچھا۔ اصل بات شروع کرنے سے قبل چند ادھر ادھر کی باتیں کرنا ضروری تھا۔ پھر رانا اورنگزیب مخاطب ہوا اور بولا کہ جارج تمہیں تو پتہ ہے رانا ناصر الیکشن پر کھڑا ہے اور وہ خود چل کر اب تمہارے دروازے پر آیا ہے۔ عزت کا معاملہ ہے اس لئے رانا ناصر کو ہی ووٹ دینا ہے۔ یہ وہی رانا ناصر تھا جس نے جارج مسیح کو اس وقت مجبور کیا جب وہ سخت بیمار تھا اور اس کے بیٹے کو سکول سے چھڑوا کر کام پر لگایا۔ جارج مسیح نے اس وقت بڑی منتیں کیں کہ چوہدری صاحب چند دنوں کی بات ہے پھر میں کام پر آجاؤں گا لیکن رانا ناصر نے کہا کہ تمہارے بیٹے نے کون سا ڈی سی لگنا ہے اسے کام پر بھیج دو۔ جارج مسیح نے اپنے بیٹے کو کام پر بھیج دیا اور بچے کی تعلیم کا خواب ادھورا ہی رہ گیا۔ رانا ناصر کو وہ بات آج بھی یاد تھی اور جارج کو بھی وہ دن کبھی بھول نہیں پائے۔ مہمانوں کی باتوں کے دوران ہی جارج نے چائے پانی کا پوچھا لیکن اسے یاد آیا کہ وہ تو عیسائی ہے اور اس کے گھر کے برتن بھلا مہمانوں کی خاطر کے لیے کہاں استعمال ہو سکتے ہیں۔ اس نے بیٹے کو بوتلیں لانے کے لئے کہا۔ بڑا بیٹا بھاگ کر کوکا کولا کی بوتلیں پاس والی دوکان سے لے آیا۔ شیشے کی ان بوتلوں پر عیسائیت کا کوئی لیبل نہ تھا اور مہمانوں نے وہ بوتلیں پی لیں جیسے ناپاکی تو دھات کے برتنوں میں ہو۔ جارج مسیح بھلا رانا اورنگزیب کو کیسے انکار کر سکتا تھا خاص طور پر جب اس نے رانا اورنگزیب کا قرض اتارنا تھا اور اس کی زندگی کے شب و روز تو رانا اورنگزیب کے گھر سے جڑے ہوئے تھے۔ غلامی اور مجبوری کی زندگی تو ایسے ہی جیسے کسی

صحرا میں داخلے کے بعد نکلنے کا راستہ نہیں ملتا اور صحرا ہی بقیہ فیصلوں کا بادشاہ ہے۔ الیکشن سے دو روز قبل رانا ناصر نے اپنی برادری کو اپنے ڈیرہ پر اکٹھا کیا اور ایک جاندار تقریر کی جس کا خلاصہ یہی تھا کہ علاقے کے بڑے سیاستدان گھرانوں سے جان چھڑوانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ہم اپنی برادری اور خون کے تحفظ کے لئے ان کے خلاف کھڑے ہوں اور خود پر اعتماد کریں۔ انہی ابھرتے ہوئے جذبات اور حقوق کی سربلندی کے نعروں سے سرشار گاؤں کے لوگوں نے بقیہ دن گزارے اور الیکشن کا دن آ گیا۔ دونوں امیدواروں نے اپنی اپنی برادریوں کے ووٹ ڈلوائے۔ پورا دن الیکشن کی گہما گہمی میں گزر گیا۔ جارج مسیح نے اپنے خاندان اور رشتہ داروں کے ووٹ رانا ناصر کو دلوائے کیونکہ اسے علم تھا اگر رانا ناصر ہار گیا تو الزام اس پر آئے گا کہ ووٹ دوسرے دھڑے کو دے دیئے ہیں۔ ووٹنگ کا ٹائم ختم ہو گیا پھر گنتی شروع ہوئی اور ایک گھنٹے کی بے چینی کے بعد رزلٹ کا اعلان ہوا۔ رانا ناصر پانچ ووٹوں سے الیکشن جیت گیا۔ جیت کی خوشی کا جشن شروع ہو گیا۔ ہر کوئی رانا ناصر اور رانا اورنگزیب کو مبارکباد دے رہا تھا۔ جارج مسیح پاس کھڑا سب کو دیکھ رہا تھا لیکن کسی کی نظر اس پر نہ پڑی۔ پھر کچھ بھیڑ کم ہونے پر رانا اورنگزیب نے جارج کو بلایا اور کہا کہ فارم پر جاؤ اور بھینسوں کو چارہ ڈالنے کا انتظام کرو۔ جارج نے اورنگزیب اور ناصر کو سلام کیا۔ اور فارم کی طرف چل پڑا۔

☆.....☆

وطن کی مٹی

سارے گھر میں ہنگامہ برپا تھا۔ بچے، بزرگ، رشتہ دار اور دوست احباب سب شور میں اپنا حصہ ڈال رہے تھے، خوشی کے جذبات نے جدائی کی ہلکی کڑواہٹ کو مسخ کر دیا تھا۔ صرف ماں نے کڑواہٹ کو اپنے ذہن میں جمتا ہوا محسوس کیا۔ شکیل دولہا کی طرح گھر میں گھوم رہا تھا۔ اس کا جرمنی کا ویزا لگ گیا تھا اور جہاز میں سوار ہونے سے پہلے یہ اس کی آخری رات تھی۔ بچوں نے شور مچا مچا کر اپنی خواہشوں کے انبار شکیل کے سامنے لگا دیئے تھے۔ رشتہ دار اور دوست اسے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ کر کہتے کہ جرمنی جا کر ہمیں نہ بھول جانا اور وہ بڑی سادگی سے جواب دیتا، بھلا میں کیسے آپ کو بھول سکتا ہوں۔ دوست اسے ماضی کی یادیں دہراتے رہے اور شکیل انہیں جرمنی پہنچ کر ان کے ویزے کا بندوبست کرنے کا وعدہ کرتا رہا۔ سارا گھر آج خوابوں کے رنگین سائے میں کھلتا رہا۔ تکونڈی گاؤں کے اس گھر میں جہاں ہمیشہ بھینسوں اور فصلوں کا ذکر ہوتا تھا وہاں آج برلن اور وہاں کے رہنے والے گوروں، گوریوں اور کرنسی مارک کا ذکر زور وشور سے جاری تھا۔ بھائی اور بہنیں شکیل کو گوریوں سے بچنے کی تنبیہ اس طرح کر رہے تھے جیسے گوریاں اسے دیکھ کر ہی پہلو میں آ گریں گی۔

شکیل نے والد کی وفات کے بعد وراثت میں حاصل ہونے والی اپنی اور

والدہ کی زمین فروخت کر کے ویزہ کی رقم ادا کی، کپڑے، جوتے اور دوسرا ضروری سامان خریدنے کے بعد بچ جانے والی رقم کے مارک خرید لیے۔ شکیل کے پورے خاندان کو یقین تھا کہ شکیل کے جرمن پہنچنے کے بعد خاندان کی زندگی بدلنے والی ہے۔ خاندان کی ساری امیدیں بائیس سال کے شکیل پر مرکوز تھیں۔ خواہشوں کا ہمالیہ اپنے کندھوں پر اٹھائے شکیل کرائے کی کار کی اگلی سیٹ پر براجمان تھا۔ پچھلی سیٹوں پر اس کا بڑا بھائی اور دو بچپن کے دوست بیٹھے تھے۔ شکیل نے شلوار قمیض کے اوپر کالے رنگ کی واسکٹ پہن رکھی تھی۔ کار گوجرانوالہ سے لاہور کی طرف جانے والے جی ٹی روڈ پر رواں دواں تھی۔ اس کے پیچھے آنے والی ویگن میں شکیل کا بھائی، بہنیں اور کچھ رشتہ دار سوار تھے، جو شکیل کو ائیرپورٹ پر الوداع کہنے آ رہے تھے۔ سب کی آنکھوں میں نیند کا نشہ تیرتا دکھائی دے رہا تھا کیونکہ کوئی بھی تین گھنٹوں سے زیادہ سو نہیں سکا تھا۔

ائیرپورٹ پہنچ کر شکیل نے سب کو الوداع کہا۔ شکیل کی بہنوں اور دوستوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ شکیل بھی برداشت نہ کر سکا اور پھر منہ دوسری طرف کر کے آنکھوں اور ناک سے بہتے پانی کو رومال سے صاف کرتا رہا۔ اپنوں سے بچھڑنے کے غم کو اس نے زندگی میں پہلی دفعہ محسوس کیا تھا۔ اپنوں سے دور اجنبی سرزمین پر زندگی گزارنا اسے دشوار محسوس ہو رہا تھا، لیکن اپنے اور خاندان کے شاندار مستقبل کی خاطر یہ دشواری لبھاتی تھی۔ بورڈنگ پاس لے کر شکیل جب جہاز میں سوار ہوا تو اسے گاؤں کی گلیاں، کھیت اور وہ لوگ بھی یاد آنے لگے جن کا شکیل کی زندگی سے براہ راست تو کوئی تعلق نہ تھا لیکن وہ گاؤں میں موجود پرانے درختوں کی طرح، گاؤں کا وجود تھے۔ پہلی دفعہ جہاز میں سوار ہونے کا خوف الگ تھا۔ جہاز نے جب زمین سے بوسہ توڑا اور آزاد فضا میں شکیل کی نئی منزل کی طرف پرواز کی تو شکیل کے جذبات اس عاشق کی

طرح تھے جو اپنی محبوبہ سے بچھڑ کر میدان جنگ میں شجاعت کا مظاہرہ کرنے جا رہا ہو۔
جہاز برلن کے ہوائی اڈے پر اترا تو شکیل کا دوست اکرم اسے اپنے ہمراہ لے جانے
کے لئے موجود تھا۔ برلن سے وہ دریائے ڈینیوب کے کنارے بسے شہر اولم پہنچے۔
دریائے ڈینیوب جو کالے جنگلوں سے نکل کر یورپی تہذیب کے گن گاتے مشرقی
تہذیب کے جادوئی پانیوں میں ڈوب جاتا ہے۔ اس دریا کے کنارے شکیل نے نئی
زندگی کے خواب کی تعبیر دیکھی۔ اکرم اپنے پانچ دوستوں کے ہمراہ دو کمروں کے فلیٹ
میں رہتا تھا۔ وہ اپنا کھانا خود بناتے۔ شکیل دو دن تک تو مہمان کی صورت رہا لیکن
تیسرے دن اکرم نے شکیل کو دریا کے کنارے موجود ایک ہوٹل میں برتن صاف
کرنے کی نوکری دلوادی۔ شکیل کو ناگوار تو گزرا لیکن پھر اس نے سوچا، کون سا گاؤں
کے لوگ اسے دیکھ رہے ہیں۔ وقت گزرتا رہا اور نوکریاں بدلتی رہیں۔ شکیل ہر مہینے
اپنے بھائیوں کو رقم بھجواتا رہا۔ اس نے دو سالوں میں بچت کر کے کچھ رقم جمع کر لی تھی
اور پھر اکرم کے ساتھ مل کر دریا کے کنارے ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ بنا لیا۔
ریسٹورنٹ کے اندر ایک چھوٹا سا شراب خانہ بھی بنا لیا۔ آمدن بڑھنے لگی تو شکیل نے
پاکستان میں اپنی خوابوں کے محل کو حقیقت کا روپ دینے کا فیصلہ کیا۔ فون پر بھائیوں
سے مشورہ کیا اور گاؤں میں نیا مکان تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا۔ کوٹھی تعمیر ہوئی تو پھر گاؤں
میں زمین خریدنے کا منصوبہ شروع ہوا۔ ایک مربع زمین خریدی گئی۔ شکیل نے اپنے
بڑے بھائی فیروز سے مشورہ کر کے گوجرانوالہ شہر میں کوٹھی تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا۔ شکیل
کی خواہش تھی کہ پلاٹ بریگیڈیئر افتخار والے روڈ پر واقع ہونا چاہیے۔ پلاٹ خریدنے
کے بعد گھر بھی تعمیر ہو گیا۔ گھر تعمیر ہونے تک شکیل کے جرمن میں دس سال گزر چکے
تھے۔ شکیل کو اب جرمنی کی شہریت بھی مل گئی تھی اور گھر والوں کے اصرار پر اس نے
پاکستان آنے کا فیصلہ کر لیا۔ شکیل کی والدہ اور اس کے بھائیوں نے اس کی شادی کا

بھی فیصلہ کر لیا تھا۔ شکیل کے دونوں بھائیوں کی کوشش تھی کہ اس کی شادی ان کے
سسرال میں ہو۔ شکیل جیسے پارس کو کون ہاتھ سے جانے دینا چاہتا تھا۔ ادھر شکیل نے
رشتہ داروں، دوستوں اور گھر والوں کے لئے خریداری کے بعد تین بڑے بیگ بھر
لیے تھے۔ جب وہ جرمنی سے لاہور ائیر پورٹ پر اترا تو اس کا استقبال کسی دوسرے
ملک کے حکمران سے کم نہ تھا۔ شکیل پہلے سے بالکل بدل چکا تھا۔ وہ تو اب بالکل انگریز
لگتا تھا۔ رنگ گورا، چھوٹے بال، جینز کی پتلون پر آدھے بازو والی شرٹ اور ہاتھ میں
گولڈن گھڑی، گلے میں سونے کی زنجیر اور آنکھوں پر ریبن کی عینک نے اسے فلمی
ستارے کی طرح پرکشش بنا دیا تھا۔

ائیر پورٹ سے گاؤں تک کا راستہ انہی ارمانوں میں گزر گیا کہ گاؤں کے
دوستوں اور دوسرے لوگوں سے ملاقات ہوگی۔ گاؤں پہنچ کر شکیل نے ایک رات
آر[illegible] اور اگلے دن سارے پرانے دوست اس کے گرد ایسے اکٹھے ہوئے جیسے کوئی
سچ مچ کا انگریز گاؤں میں آ گیا ہو۔ جرمنی کی دس سال کی بیتی زندگی کے واقعات جب
گاؤں والوں نے سنے تو انہیں وہ زندگی طلسماتی محسوس ہوئی۔ شکیل کے نزدیک جرمن
کی سرزمین جنت ہے، وہی جنت جس کا ہمارے خدا نے وعدہ کیا ہے۔ شکیل نے اپنے
دوستوں میں تحفے تقسیم کیے تو دوستی کے راستے میں پھیلے دس سال بھرے بھرے محسوس
ہونے لگے۔ رشتہ داروں میں جب چیزیں تقسیم کیں تو ہر ایک کو اپنی چیز سے زیادہ یہ فکر
تھی کہ دوسروں کو کیا ملا ہے۔ رشتہ داروں میں پھیلے ناانصافی کے قصے البتہ شکیل تک
پہنچنے سے پہلے ہی ہوا میں تحلیل ہو گئے۔ ابھی کچھ دن گزرے تھے کہ گھر میں شکیل کی
شادی کی چہ میگوئیاں سرد جنگ میں بدل گئیں۔ شکیل کا سب سے بڑا بھائی فیروز چاہتا
تھا کہ شکیل کی شادی اس کی سالی سے ہو جبکہ فیروز سے چھوٹے بھائی کی بھی یہی
خواہش اپنے سسرال تک محدود تھی۔ والدہ نے البتہ فیصلہ فیروز کے حق میں کر دیا اور

شکیل کی منگنی فیروز کی سالی عالیہ سے ہوگئی۔ عالیہ نہ صرف خوبصورت تھی بلکہ گریجویٹ بھی تھی۔ عالیہ اور اس کے والدین اس شادی سے خوش تھے کہ لڑکا کمانے والا ہے اور خوب کمانے والا ہے۔ شکیل کے دوسرے بھائی کو یہ منگنی ناگوار تو گزری لیکن وہ حالات کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے خاموش رہا۔ شکیل کے ملک واپس آنے کے دو ماہ بعد شادی ہوگئی۔ شادی دھوم دھام سے ہوئی۔ ایسی شادی گاؤں والوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ آتش بازی، مختلف انواع کے کھانے اور سب سے بڑھ کر موسیقاروں کی آمد نے وہ سماں باندھا کہ ایک ماہ تک شادی کی باتیں موضع بحث رہیں۔ شادی کے بعد شکیل اپنی بیوی عالیہ کے ہمراہ گوجرانوالہ شہر میں سٹیلائٹ ٹاؤن کے بریگیڈیئر افتخار والے روڈ پر واقع اس گھر میں سکونت پزیر ہوا جہاں فیروز پہلے ہی اپنی بیوی بچوں کے ہمراہ رہ رہا تھا۔ بالائی منزل میں شکیل اور اس کی بیوی رہنے لگے جبکہ نچلی منزل پر فیروز اور اس کی بیوی بچے رہتے تھے۔ شکیل چھ ماہ تک پاکستان میں رہا اور پھر ایک دن جرمنی سے اس کے کاروباری دوست اکرم کا فون آیا کہ کام کے بڑھنے کی وجہ سے وہ اکیلا سنبھالنے سے قاصر ہے۔ شکیل نے واپس جانے کا فیصلہ کرلیا۔ شکیل کے بھائی فیروز نے شہر میں کاروبار شروع کرنے کا مشورہ کیا جس کے جواب میں شکیل نے اسے جرمنی سے رقم بھجوانے کا وعدہ کیا۔ شکیل نے نئے خواب اور نئی امنگوں کا موہنجودڑو تعمیر کیا اور جرمن کی ٹکٹ خرید لی۔ عالیہ کے لئے شکیل سے دوری کے غم کی چبھن گہری ہوتی جارہی تھی، جو اس نے زندگی میں پہلی بار محسوس کی تھی اور جس کے تدارک کے لئے اس نے آنسوؤں کی نمی سے اپنی چادر کے پلو کو بھگو دیا تھا۔ شکیل نے بھی کچھ ایسا درد محسوس کیا لیکن مرد کے آنسو آنکھوں سے دل کی طرف ٹپکتے ہیں جس کا بیرونی دنیا کو علم نہیں ہوتا۔ شکیل مطمئن تھا کہ وہ عالیہ کو اس کی اپنی بہن کے ہاں چھوڑ کر جارہا ہے اور اس کا دل لگا رہے گا۔ شکیل نے عالیہ کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ وہ جلد واپس آجائے گا،

لیکن شکیل خود کو تسلی کیسے دیتا۔ جب الوداع کہنے کے لئے اس نے عالیہ کو گھر کی چوکھٹ پر کھڑے ہوکر پیچھے مڑ کر دیکھا تو عالیہ کی آنکھوں میں درد کا سمندر دو قطروں کی صورت منجمد ہوگیا تھا، جسے دیکھ کر شکیل کے پاؤں جیسے زمین میں دھنس گئے۔ دولت، طاقت اور شہرت کے پیچھے بھاگنے والے مرد کو یہ دو آنسو ہی زندگی گزارنے اور زندگی جینے کا فرق بتاتے ہیں۔ شکیل نے اپنی آنکھیں بند کیں، اور پیچھے مڑ کر گھر کے سامنے کھڑی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس کے بھائی فیروز نے جب اسے لاہور ائیر پورٹ پر وداع کیا تو اس کی امنگوں کے موہنجودڑو میں عالیہ کی محبت کا ستون گڑ چکا تھا۔ جرمن پہنچ کر شکیل نے ایسے محنت کرنا شروع کردی جیسے ایک سال میں وہ دس سال کا سفر طے کرنا چاہتا ہو۔ شکیل ہر مہینے اپنے بھائی فیروز کو رقم بھجواتا رہا اور اسے سکریپ کے کاروبار میں سرمایہ کاری کرنے کا کہا۔ سکریپ کے کاروبار نے فیروز کو سکھا دیا کہ کوئی چیز بھی بیکار نہیں اور الجھے ہوئے انسانی رشتوں کے بگاڑ کی وجہ سے زنگ آلود مشینوں سے منافع کی صورت کئی گنا ہوجاتی ہے۔ بگڑی ہوئی مشینوں کے پرزوں کی اہمیت صرف سکریپ کا کاروبار کرنے والا ہی جان سکتا ہے۔ فیروز کو اس کاروبار سے اتنا منافع ہوا جس کا اس نے زندگی میں سوچا بھی نہیں تھا۔ فیروز نے اپنے اور بیوی کے نام پر کئی پلاٹ خرید لئے جس کا علم صرف اسے اور بیوی کو تھا۔ شکیل کے پیسوں سے کاروبار چلتا رہا۔ اسی دوران عالیہ کے ہاں بیٹے کی پیدائش ہوئی۔ شکیل فون پر بیٹے کی چیخوں اور رونے کی آواز سے بھی محظوظ ہوتا۔ ہر روز اس کی ملک واپس آنے کی لگن بڑھتی جاتی۔ شکیل کی خوشیاں چند ماہ بعد ماند پڑ گئیں جب اسے علم ہوا کہ والدہ بیمار ہے اور جگر کے السر سے ماں کی صحت روبہ زوال ہے۔ شکیل ابھی پاکستان واپس آنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اسے خبر ملی، ماں کا انتقال ہوگیا ہے۔ پردیس میں اپنے پیاروں کے بچھڑنے کا دکھ کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔ شکیل اپنے آپ کو دوش دیتا رہا کہ وہ اگر پہلے چلا

جاتا تو ماں کے ساتھ کچھ لمحے گزار لیتا۔

خوش قسمتی سے شکیل کو تین گھنٹے بعد جانے والی فلائٹ کا ٹکٹ مل گیا۔ تقریباً سات گھنٹے کے سفر کے بعد جہاز لاہور کے ائیر پورٹ پر اترا۔ تکونڈی گاؤں پہنچ کر سانجھے دکھ میں، اپنے بے یار و مددگار دکھ کو بھائیوں کے سینے سے لگ کر، آنسوؤں کی مدد سے شامل کرنے کے بعد والدہ کے پرسکون چہرے کو شکیل نے دیکھا اور یہ بات عیاں تھی کہ موت زندگی کے دکھوں کا سب سے بڑا مرہم ہے۔ والدہ کو قبر میں اتارنے سے دسویں تک بھائیوں کو جوڑے رکھنے والی آخری زنجیر کا سایہ بھی اوجھل ہو چکا تھا۔ شکیل نے جب گھر میں یہ اعلان کیا کہ وہ پاکستان میں ہی اپنی زندگی گزارے گا اور جلد ہی جرمنی میں اپنے کاروبار کو سمیٹ لے گا تو فیروز کو جیسے جھٹکا لگا۔ فیروز کو اب شکیل کے قرب میں خونی رشتے کی کشش کی حدت میں کمی محسوس ہونے لگی۔ فیروز کو علم تھا کہ اب شکیل اس سے اپنی کمائی کا حساب مانگے گا۔ ادھر تیسرے بھائی نے بھی شکیل کو فیروز کے کاروبار اور خریدی گئی جائیدادوں کے بارے میں معلومات فراہم کر کے اپنا بدلہ لینے کی پوری سعی کی۔ حساب کتاب شروع ہوا تو محبت کے سارے جذبات ایک ہی جھونکے میں پرواز کر گئے۔ فیروز گاؤں کی زمین تو تقسیم کرنے میں رضامند تھا لیکن سٹیلائٹ ٹاؤن والے گھر اور دیگر پلاٹ دینے پر رضامند نہ تھا۔ البتہ وہ شکیل کو اس کی بھیجی ہوئی رقم واپس کرنے پر مصر تھا۔ شکیل کو یہ بات پسند نہ آئی اور پھر اس تکرار میں جب عورتوں کی لگائی بجھائی شروع ہوئی تو دونوں بھائی اور ان کی بیویاں، جو رشتے میں سگی بہنیں تھیں، فصیل کے آر پار نفرتوں کے الاؤ جلائے ایک دوسرے کا سامنا کرنا کے لئے کھڑے تھے۔ شکیل ناراض ہو کر واپڈا ٹاؤن کے ایک کرائے کے گھر میں منتقل ہو گیا۔ اسے یقین تھا کہ فیروز اسے منا کر لے جائے گا اور سارے جھگڑے ختم ہو جائیں گے لیکن فیروز نہ آیا اگرچہ ایک مہینہ گزر چکا تھا۔ شکیل کا دوست احمد، شکیل کو

واپڈا ٹاؤن میں ملنے آیا تو شکیل نے اسے ساری کتھا سنا دی۔ وہ دونوں مل کر احمد کے دوست رضوان بٹ ایڈووکیٹ کے گھر مشورہ لینے گئے۔ وکیل سے مشورہ کا انجام تو ہمیشہ دعویٰ دائر کرنے کی صورت میں نکلتا ہے۔ وکیل کو فوراً منہ مانگی فیس ادا کی اور امید کا دامن تھامے خوشی خوشی گھر واپس آ کر شکیل نے ساری روداد اپنی بیوی عالیہ کو بتائی۔ دونوں کا خیال تھا کہ فیروز اور اس کی بیوی جلد ہی معافی مانگ کر ان کا حق دینے پر رضامند ہو جائیں گے۔ لیکن یہ خیال، خیال ہی رہا۔ دیوانی دعویٰ بھی خوفناک اژدھے کی شکل کا کھلونا ہے۔ مخالف اگر ڈر گیا تو ٹھیک، ورنہ یہ کون سا ڈس سکتا ہے۔ شکیل کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ انہی دنوں ملک میں عام انتخاب کی تاریخ کا اعلان ہو چکا تھا۔ ملک میں ایک نئی سیاسی جماعت نے ملک کو جنت بنانے کی تحریک شروع شروع کر رکھی تھی اور شکیل کو بھی یقین تھا کہ اس تحریک سے مملکت خداداد میں امن، انصاف اور روزگار کے دروازے کھلتے جائیں گے اور غیر ملک میں بسنے والے لوگوں کو انصاف گھر کی دہلیز پر مل جائے گا۔ شکیل الیکشن سے قبل جرمنی میں اپنے کاروبار کو سمیٹ کر واپس ملک آنا چاہتا تھا اور اس خاطر وہ ایک ماہ کے لئے واپس جرمنی گیا اور نئی امیدیں باندھ کر الیکشن سے قبل واپس آ گیا۔ نئی سیاسی جماعت الیکشن جیت گئی اور شکیل کو یقین کے سائے نے جکڑے رکھا کہ چند ماہ میں ہی انصاف کی دیوی مظلوموں کی تلاش میں گلیوں گلیوں بھاگتی نظر آئے گی۔ شکیل عدالتوں کے چکر لگاتا رہا۔ وہ ہر تاریخ پر امید باندھے گھر سے نکلتا کہ آج کوئی فیصلہ ہو گا لیکن واپس پر کچھ ملنے کی بجائے اس کے پرس سے کچھ نوٹ غائب ہوتے۔ وہ سال بھر چلتا رہا لیکن کیس تو جیسے ایک ہی جگہ پر کھڑا تھا۔ شکیل کو وہم لگا کہ یہاں ہر شخص اس کی بچائی دولت کے پیچھے ہے۔ دوست، رشتہ دار اور بھکاری سب مل کر اس سے پیسہ نکلوانے کی صورت بنائے رکھتے تھے۔ صرف دوسرے ملک میں روزی کمانے سے کیسے سارے

حقوق ختم ہوجاتے ہیں اور ذمہ داریاں باقی رہ جاتی ہیں، شکیل کے لئے یہ ایک معمہ بن گیا۔ شکیل کی سوچ اس نتیجہ پر اٹک گئی کہ یہاں ہر مالدار شخص کے پیچھے کسی اور کے خون پسینے کی محنت چھپی ہے۔ جب سالوں کے نمبروں کے علاوہ کچھ نہ بدلا تو شکیل نے خود ہی بدلنے کا فیصلہ کیا۔ شکیل نے اپنے بھائی فیروز کی مرضی کے مطابق تصفیہ کرلیا اور جو ملا اس کے ساتھ رشتوں کی قربانی بھی ہوگئی۔ شکیل کو اپنی بکھری ہوئی تنہا زندگی سے تھکن محسوس ہونے لگی تو اس نے واپس جرمن جانے کا ارادہ کرلیا۔ عالیہ بھی اپنوں سے دور راحت کی متلاشی تھی۔ دونوں میاں بیوی کے متفقہ فیصلہ کے بعد شکیل نے پاسپورٹ بنوائے اور جرمنی کے ویزے لگوالے۔

پندرہ دنوں کے اندر ہی شکیل، عالیہ اور ان کا کمسن بیٹا لاہور ائیرپورٹ پر پہنچ گئے۔ شکیل نے نہ تو رے بین کی عینک پہنی تھی اور نہ ہی سونے کا لاکٹ اس کے گلے میں تھا۔ شکیل نے ائیرپورٹ کے اندر داخل ہوتے وقت آخری دفعہ پیچھے مڑ کر دیکھا تو آج کوئی بھی اسے الوداع کہنے کے لئے موجود نہ تھا۔ شکیل نے محبت بھری نظروں سے اپنی بیوی اور بیٹے کو دیکھا اور انہیں ساتھ لے کر ائیرپورٹ کے اندر داخل ہوگیا۔

☆.....☆

دھرم

رات کا اندھیرا اپنے اندر آسمان کی وسعت لئے تہہ در تہہ پھیلا ہوا ہے۔ کرشانگر گاؤں کی تاریک گلیوں میں گہری خاموشی سے پرے ندی کا پانی سانپ کی پھنکار جیسی آواز کے ہمدم بہہ رہا ہے۔ گاؤں میں ہندوؤں کی آبادی مسلمانوں کے چند گھروں کے گرد پھیلی ہوئی ہے جیسے ان کی حفاظتی فصیل ہو۔ مسلمانوں کے گھروں سے جڑے ہوئے امام باڑہ اور گاؤں کے باہر واقع مندر نے اپنی حیثیت اور پاک بازی کا ایک دوسرے کو علم نہ ہونے دیا تھا۔ دونوں عمارتیں ایک دوسرے سے لاعلم اور بے پروا امام حسین کے گھوڑے اور گاؤ ماتا کے تقدس سے ہمکنار تھیں۔ دونوں کے جسموں سے گاؤں کی ندی کے پانی کو پوتر کیا جاتا تھا۔

محرم کے دنوں میں جب دور دور سے لوگ مجلس میں شرکت کرنے آتے تو گاؤں کے ہندو بھی امام حسین کی شہادت کے بیان کو سنتے اور اپنی مرادیں پوری کرنے کے لئے گھوڑے کے نیچے سے جھک کر گزرتے اور روضہ کو بوسہ دیتے۔ بیساکھی کا میلہ ہو یا ہولی ہو، مٹی اور رنگوں کی تہہ مسلمان اور ہندو کے چہروں پر یکساں جمتی۔ گیہوں کی فصل کی خوشبو کو ہوا بلا امتیازِ مذہب گلیوں اور گھروں کے اندر بکھیرتی۔ کشادہ گھروں کو نوجوان مسلمانوں نے ہی آزادی کی جنگ کے بعد تعمیر کیا تھا۔ ہندو سرپنچ مسلمانوں کے گھریلو جھگڑوں کے تصفیہ کے لئے پنچایت

لگاتے۔ چند ایک موقعوں پر تو مسلمان لڑکوں نے مندر کی خستہ دیواروں کو مرمت بھی کیا تھا۔

محرم کا چاند نکلنے سے قبل علی رضا کے گھر مسلمان مردوں کا اجتماع ہوا۔ علی رضا لنگی کے اوپر سفید پوشاک پہنے چارپائی پر بیٹھا ہے۔ سبھی کے چہروں پر اضطراب نے سلوٹیں ڈال دی ہیں۔ علی رضا سب سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ 21ویں صدی میں ہمارے حالات بدل گئے ہیں۔ ہمیں پہلے سے خبریں مل رہی ہیں کہ جلوس کو روکا جائے گا، ہمیں تیار رہنا چاہیے، ''ہم امام حسین کے ماننے والے ہیں، اپنے مذہب کے لئے قربانی دینی پڑی تو دیں گے'' علی رضا کے بیٹے حسن نے آواز بلند کی۔ دوسرے لڑکوں نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ہم ان سے لڑ نہیں سکتے، آخر ہم اقلیت ہیں۔ علی رضا نے غصے میں اپنے بیٹے کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ اگر لڑ نہیں سکتے اور اقلیت ہیں تو پھر ہندو بن کر اکثریت بن جائیں؟ حسن نے سوالیہ نظروں سے چارپائیوں پر بیٹھے ہوئے غمگین مردوں کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''بھلا دھرم کیسے چھوڑ سکتے ہیں'' علی رضا کے ساتھ بیٹھے ہوئے ذاکر اہل بیت محمد مہدی نے لقمہ دیا۔ ہم تو کسی کو اپنا مذہب تبدیل کرنے کا نہیں کہتے، تو پھر کسی کو ہمارے مذہب سے کیا تکلیف ہے، پچھلی چارپائی پر بیٹھے ہوئے نوجوان نے ہوا میں انگلی لہراتے ہوئے اپنی بے کسی سے باغی ہوتے ہوئے کہا۔ ایک بوڑھے شخص نے گہری سوچ سے اپنا دامن نکالتے ہوئے، اس چھوٹی محفل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ہم صدیوں سے یہاں آباد ہیں اور ہم نے تو تقسیم کے دوران بھی نہرو کے انڈیا میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ ہمارے پاس لٹانے کو کچھ نہ تھا اور نہ ہی کسی نے لوٹنے کا تردد کیا۔ شہروں میں ہونے والی مذہبی، لسانی اور گروہی لڑائیوں کا یا تو ہمیں علم نہ ہوتا اور اگر ہوتا تو اس وقت جھگڑا مع وجہ کے ہوا میں تحلیل ہو چکا ہوتا۔ جب نہرو خاندان الٰہ آباد کو نہ بچا سکا تو پھر کسی نے

آگ بجھنے ہی نہ دی۔

علی رضا کے بیٹے حسن نے اس ذہین بوڑھے سے پوچھا کہ آخر حالات بدل کیسے گئے اور نفرت کی آگ ہم تک کیسے پہنچی؟ بوڑھے نے جواب دیا۔ بیٹا حسن! ''ہم مسلمان تو پہلے ہی ماضی میں زندہ رہتے ہیں۔ اب ہندو بھی ماضی کی طرف مائل ہے۔ مسلمان جب ماضی کی طرف دیکھتا ہے تو اسے سحر طاری کر دینے والا شاندار دور نظر آتا ہے اور ہندو کو برداشت نہ ہونے والا جبر نظر آتا ہے جو ان کے پرکھوں نے محسوس کیا''۔ بوڑھے کی ان باتوں سے سب کے اوپر خاموشی کا غلاف چڑھ گیا، گویا سب سوچ رہے ہوں کہ یہ ماضی والی بیماری تو جیسے لاعلاج ہے۔ مجلس برخاست ہونے سے پہلے سب نے متفقہ فیصلہ کیا کہ وہ معمول کے مطابق ہی سارے کام سرانجام دیں گے، جیسے وہ ہمیشہ سے کرتے چلے آئے ہیں۔

اگلے کچھ دن تو ایسے گزرے جیسے زندگی اپنی روانی میں ہی مست ہے اور کسی تبدیلی کی تکلیف سے کوسوں دور۔ دسویں محرم کے دن امام باڑہ میں امام حسین کے روضہ کی شبیہہ کو زرق برق کاغذوں سے سجا دیا گیا۔ گھوڑے پر زین کس دی گئی اور اس کی گردن اور چہرے پر سرخ رنگ، شہیدوں کے خون کی یاد تازہ کرنے کے لئے، انڈیلا گیا، زین کے ساتھ تلوار لٹکی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ ماتمی کالا لباس پہنے جوق در جوق امام باڑہ کے صحن میں اکٹھا ہونا شروع ہو گئے۔ ان کے ننگے پاؤں مٹی کی حرارت کو محسوس کر رہے تھے۔ ذاکر اہل بیت جب سٹیج پر تشریف لائے تو تمام لوگ نیچے بیٹھ گئے۔ حسن اور چند دوسرے نوجوان مجمع کے پیچھے کسی بھی خطرہ سے نبرد آزما ہونے کے لئے تیار کھڑے تھے۔ ذاکر اہل بیت نے اپنے مرثیوں سے ماتمی حضرات کو غمِ حسین سے روشناس کرایا۔ کوئی آدھے گھنٹہ بعد عزاداران جلوس کی شکل میں شبیہہ کے ساتھ امام باڑہ سے باہر نکلے اور نوحے پڑھتے ہوئے اپنے سینے پیٹنے لگے۔ حسن، شبیہہ کے

پاس موجود تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن کسی انجانے خوف سے بدکی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ گلی کے کونے پر جب جلوس پہنچا تو حسن جلوس کے آگے آکر زنجیر زنی کرنے لگا۔ کچھ دور نوجوان بھی یا حسین، یا حسین، کہتے ہوئے اپنی ننگی کمر پر زنجیروں کے وار کرنے لگے۔ خون کے چھینٹے جب زمین پر گرنے لگے تو ان کے ہاتھوں کی حرکت اور تیز ہوگئی، وہ تو گویا زمان ومکاں سے بے پرواہ ہوگئے۔ اتنے میں ایک گائے بھاگتی ہوئی جلوس کے سامنے آن پہنچی، گائے کو تین ہندو لڑکے ہانکتے ہوئے آرہے تھے۔ گائے زنجیر زنی کرنے والوں نوجوانوں کے پاس دیوار کے ساتھ سہمے ہوئے کھڑی ہوگئی۔ آگے جانے کا راستہ نہ تھا۔ یا حسین، یا حسین کی آواز گلی میں گونج رہی تھی۔ خون کے چند قطرے گائے کے جسم پر پڑے اور پھر جب گائے ڈر کر واپس بھاگی تو ہندو لڑکے بھی اس کے پیچھے بھاگے۔ جلوس رینگتا ہوا آبادی سے باہر نکلنے کی خاطر گلی کے آخری موڑ کے قریب تھا کہ اچانک مخالف سمت سے ہندوؤں کا ایک گروہ ہاتھوں میں ڈنڈے، خنجر، اور بندوقیں لیۓ آن پہنچے۔ جہاں ماتمی سینہ کوبی میں اپنے ہاتھ بلند کر رہے تھے، وہاں ان کی نگاہیں اس نئے خطرے کو بھانپ گئیں جو چند لمحوں میں مذہب کے فرق کے علاوہ ہر یکسانیت کو کاٹنے کے لئے گرج رہا تھا۔ ماضی کا غم، حال کے غم میں سرایت کر گیا اور گلی میں خون، گرتی ہوئی لاشوں سے، خاک کو سرخ کرنے لگا۔ گھوڑے کے جسم پر لگے ہوئے رنگ کو خون نے اور بھی گہرا کر دیا۔ علی رضا اور اس کے بیٹے کی لاشیں، دوسرے عزاداروں کے ساکن جسموں میں اُلجھی ہوئی تھیں۔ گاؤ ماتا کی بے حرمتی کا بدلہ انسانوں اور جانور سے پورا ہوگیا تھا۔ پولیس موقع پر آگئی۔ کیمروں کی آنکھیں خون سے رنگے جسموں پر مرتکز ہوگئیں۔ مشرق سے چلنے والی ہوا کا رخ مغرب کی طرف تھا۔ تقسیم میں چلنے والی تلوار آج کرشنا نگر میں بھی پہنچ گئی۔ اس ماتم کا ماتم ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کر لکیر کی دوسری طرف فصلوں کو

مرجھاتے ہوئے جی ٹی روڈ پر واقع اہرمن آباد کی پرانی دیواروں سے ٹکرایا۔ خاک کا ایک بھنور اٹھا جس نے سورج کی روشنی مدہم کردی۔

علی رضا اپنے دومنزلہ مکان کے بالائی حصہ میں اس دیوار کے سامنے، جہاں کبھی ہندو اپنے دیوتا کی آرتی اتارتے تھے، کھڑے ہو کر اپنی داڑھی کے بالوں کو سنوار رہا تھا۔ ٹیلی وژن کی سکرین علی رضا کے سامنے پڑے آئینے میں نظر آرہی تھی۔ علی رضا نے سلائی سرمے دانی میں ڈبو کر اپنی آنکھوں میں ڈالی۔ سرمے کی رڑک سے اس کی آنکھوں میں پانی آگیا۔ اچانک اس کے کانوں میں نیوز کاسٹر کی آواز پڑی جو کہہ رہی تھی کہ انڈیا کے سیکولرازم کا بھرم آج کھل گیا۔ مسلمانوں پر ہندوستان کی سرزمین تنگ کردی گئی ہے۔ آج کرشنا نگر میں 50 مسلمانوں کو شہید کر دیا گیا اور متعدد زخمی بھی ہوئے۔ علی رضا نے اپنی آنکھیں ملتے ہوئے ٹیلی ویژن کی طرف رخ موڑا اور خبروں میں محو ہو گیا۔ اس کے چہرے پر غصے کے نشان نمایاں تھے۔ ٹیلی ویژن بند کر کے وہ فوراً نیچے آیا جہاں ایک کمرے میں چٹائی پر بیٹھ کر اس کا بیٹا حسن کھانا کھا رہا تھا۔ جلدی کھانا ختم کرو اور جوتے پہن کر میرے ساتھ آؤ! علی رضا نے اپنے بیٹے حسن کو غصے میں بلند آواز سے حکم دیا۔ خیریت تو ہے۔ حسن نے اپنے باپ سے پریشانی میں پوچھا۔ مسلمان ذبح ہو رہے ہیں اور ہم گھر میں آرام سے بیٹھے ہیں۔ علی رضا نے وضاحت کی۔ دونوں جلدی میں مسجد پہنچے تو کافی لوگ وہاں پہلے سے موجود تھے اور اللہ اکبر، اللہ اکبر کے نعرے لگا رہے تھے۔ پندرہ بیس منٹ میں لاؤڈ سپیکر پر ہونے والے اعلان سے سینکڑوں لوگ جمع ہو گئے اور جلوس جی ٹی روڈ کی طرف چل پڑا۔ جلوس سے جی ٹی روڈ کی ٹریفک رک گئی۔ پرانے ٹائروں کو آگ لگا کر سڑک کے بیچ رکھ دیا گیا۔ علی رضا اور حسن جلوس کی سرپرستی کرتے ہوئے آگے چل رہے تھے۔

انڈیا کے خلاف نعروں سے فضا گونج اٹھی۔ گاڑیوں میں بیٹھے مسافر ڈرے ہوئے تھے۔ کچھ لڑکوں نے جلوس سے نکل کر کھڑی گاڑیوں کے شیشے بھی توڑ دیئے اور واپس جلوس میں شامل ہو کر پھر نعرے لگانے لگے۔ علی رضا کی سربراہی میں جلوس ہندوؤں اور سکھوں کے بنائے ہوئے گھروں کو پیچھے چھوڑ آیا تھا جن میں اب ایک بھی ہندو یا سکھ رہائش پذیر نہ تھا۔ محرم کے جلوس کے قریب گزرتے ہوئے علی رضا نے نفرت انگیز نظروں سے دیکھا اور بڑبڑاتے ہوئے آگے گزر گیا۔ جہاں یہ جلوس بچوں کے لئے تفریح کا سامان تھا، تو کچھ کے لئے سیاسی مقصد کے لئے ضروری کاروائی تھی۔ علی رضا کی آنکھوں میں نفرت کے انگارے پھوٹ رہے تھے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ سامنے اگر ہندو موجود ہوں تو انہیں کاٹ ڈالے۔ اسے اپنی نفرت کی آگ سے جلانے کا کوئی سامان نظر نہیں آ رہا تھا۔ علی رضا کی نظر سڑک کے پار گھروں پر پڑی تو اس کے پاؤں خود بخود ادھر مڑ گئے۔ سڑک پار کر کے علی رضا ان مکانوں کے قریب آ گیا۔ وہاں بچے ننگے پاؤں مٹی کے ڈھیر کے اوپر بیٹھ کر کھیل رہے تھے۔ اتنے بڑے جلوس کو دیکھ کر خوف کی ایک لہر نے ان کے جسموں میں کپکپی طاری کی اور وہ بھاگ کر اپنے گھروں میں داخل ہو گئے۔ مٹی کے ٹیلے کے قریب بیٹھے ہوئے کتے بھی نعروں کی آواز سن کر دبک گئے۔ جلوس جس اندرونی سڑک پر آ رہا تھا وہاں عیسائیوں کی آبادی تھی اور ایک قدیم گرجے کا دروازہ اس اندرونی سڑک پر کھلتا تھا۔ علی رضا اور اس کے سینکڑوں ساتھیوں کی نظروں سے گرجا اور مندر کا فرق اوجھل تھا۔ گرجا کے سامنے پہنچ کر علی رضا رک گیا اور اس کے پیچھے آنے والے نعرے باز بھی رک گئے۔ علی رضا نے اپنے قریبی ساتھیوں کے کان میں سرگوشی کی اور چند منٹ بعد گرجا کی صلیب کا رنگ ڈھلتے سورج کی سرخی میں رنگ گیا۔ ایک آگ اٹھی جو قریبی مکانوں اور ان کے اندر بسنے والوں کو جلا کر ہوا میں تحلیل ہو گئی۔

زمین کا وجود پاک ہوا اور علی رضا کے جسم اور روح میں شانتی آ گئی۔ پولیس کے آنے سے قبل ہی جلوس، غازیوں کی صورت واپس چلا گیا۔ سورج مایوسی کی چادر اوڑھے مغرب کی طرف کہیں دھنس گیا۔ تیز آندھی کے بعد بارش آئی اور بادل دھویں اور آگ سے لپٹی دیواروں کو مرہم لگا کر کہیں افق میں گم ہو گئے۔ جی ٹی روڈ پر ایک دوسرے کا پیچھا کرتی ہوئی گاڑیاں زندگی اور موت کے کھیل سے بے پرواہ اپنے سفر پر رواں دواں تھیں۔

☆-----☆

چپل گوشت

رمضان لاہور کی سول عدالت میں بطور اہلمد (ریکارڈ کیپر) تعینات ہے۔ وہ پندرہ سال قبل اپنے چچازاد بھائی جو ہائی کورٹ میں ملازم تھا، کی کوششوں سے نوکر ہوا۔ نوکری ملنے سے تعلیم کا سلسلہ ایف اے تک منقطع ہوگیا۔ شادی کے بعد، بیوی اور تین بچوں کا بوجھ فائلوں کے ساتھ شامل ہوگیا۔ زندگی اسی بوجھ سے لرزہ براندام تھی۔ تقریباً بیس مختلف سول ججوں کے ساتھ کام کرتے کرتے طبیعت کی کرختگی اور الجھن نے افسانہ برپا کر دیا تھا۔

رمضان کرشن نگر کی تنگ گلی میں اپنے ابا کے گھر مکین تھا۔ ابا کی صحت سے یہ گمان ہوتا تھا کہ چند سالوں میں وہ اس تنگ گلی کے بوسیدہ گھر کا مالک بن جائے گا۔ وہ روزانہ گھر کی پریشانیوں سے چھٹکارا پا کر لوئر مال پر واقع ایوان عدل کی تیسری منزل پر واقع عدالت کے ساتھ جڑے ہوئے چھوٹے کمرے میں عدالتی وقت شروع ہونے سے پندرہ منٹ قبل ہی پہنچ جاتا۔ اس کمرے میں دو عدالتوں کے اہلمد اپنی فائلوں کے ہمراہ گوشہ نشین تھے۔ کرشن نگر سے ایوان عدل تک کا راستہ رمضان جیسے چھوٹے ملازمین اور مزدوروں کے بے ہنگم ہجوم سے لدا رہتا تھا۔ الجھے راستوں، الجھی فائلوں کے ساتھ رمضان کی اپنی زندگی بھی الجھی ہوئی تھی۔ دفتر میں پہنچ کر وہ ترتیب دی ہوئی فائلوں کو ہمراہ لسٹ عدالت میں پہنچا دیتا۔ عدالتی سمن، روبکار اور

نقولات کی تیاری اس کا روزانہ کا کام تھا۔ تانگے میں جتا ہوا گھوڑا جسے اپنی منزل سے بے پرواہی ہو۔ وہ اپنا کام ایمانداری سے کرتا لیکن اس خلش کے ساتھ کہ اس کے پاس آنے والے بے چین لوگوں کو چین دینے کا کوئی آلہ اس کے پاس موجود نہ تھا۔ اس کی نظر میں انصاف کا نظام مظلوم لوگوں کا ظلمت کدہ تھا۔ جج صاحب کہاں کے رہنے والے ہیں، پیسے لیتے ہیں یا سفارش مان لیتے ہیں۔ یہ سوالات روزانہ آنے والے سائلین میں سے کچھ اس سے پوچھتے اور وہ ہر دفعہ جواب دیتا کہ مجھے علم نہیں، خود جا کر پوچھ لو جج صاحب سے۔ اس کا ساتھی اہلمد اسے سمجھاتا کہ نوکری کرنے کا طریقہ تم نہ سمجھ سکو گے۔ ارے بھائی! یہ سائلین خدا کی طرف سے بھیجے گئے فرشتے ہیں۔ ان سے مانگتے رہو اور بدلے میں امید کے سکے ان کے ہاتھ میں تھماتے جاؤ۔ وہ بھی خوش ہم بھی خوش۔ تنخواہ تو بس ٹپ ہی سمجھو۔ اصل روزگار تو یہ لوگ ہیں جو اکثر ہمیں خوش کرنے اور ہمدردی جیتنے کے لئے کچھ نہ کچھ دے جاتے ہیں۔ ساتھی اہلمد نے یہ بھی سمجھایا کہ اگر ان سائلین سے زیادہ قربت دکھائی تو وہ مال مفت کی طرح استعمال کریں گے۔ رمضان کو یہ باتیں پسند نہ آتی۔ لوگوں کو ڈرانا اور پھر تسلی دے کر بیوپار کرنا اس کے بس سے باہر تھا۔

آج صبح اٹھتے ہی بیوی نے بتایا کہ منا بیمار ہے۔ رات سے اسے بخار ہے۔ رمضان نے کپڑوں والی الماری میں بکھرے کپڑے ہٹائے اور پولی تھین بیگ میں مختلف انواع کی گولیاں اور شربت نکال کر ان کے اوپر کندہ نام پڑھے اور کال پول سیرپ نکال کر بیوی کو تھمایا اور ہدایت دیتے ہوئے کہنے لگا کہ دن میں تین بار پلانا، اگر شام تک بخار نہ اترا تو ڈاکٹر کے پاس جائیں گے۔ وہ خود تیار ہونے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر عدالت پہنچنے میں دیر ہوگئی تو جج صاحب کے غصے کے سامنے نظریں جھکا کر سوری کہنا پڑے گا اور وہ مطمئن ہوئے بغیر کمرے سے نکل جانے کا حکم سنائیں گے اور

وہ بیوی اور حالات کو کوستے ہوئے واپس اپنے کمرے میں پہنچ جائے گا۔ رمضان
ہمیشہ کی طرح مقررہ وقت سے پندرہ منٹ قبل ہی دفتر پہنچ گیا۔ گھر سے دوری نے
اسے اپنے بیٹے کی بیماری سے جڑے تمام خدشات سے برسرپیکار کر دیا تھا۔ اس کا جی
چاہا کہ ابھی رخصت لے کر گھر چلا جائے لیکن سائلین کے ہجوم اور دفتری کام نے اسے
اپنی طرف کھینچ کر ذمہ داریوں کے دو پاٹوں میں الجھا دیا تھا۔ اس کی سوچ گھر میں
لیٹے بیمار بچے پر منجمد تھی اور جسم خود ہی روزانہ کی ایک جیسی ذمہ داریاں نبھانے میں
ایسے جتا ہوا تھا جیسے کام میں سوچ کا نہیں عادت کا عمل دخل تھا۔ کمرے میں بازو والی
کرسی پر بیٹھے ہوئے دوسری عدالت کے اہلمد نے جب رمضان کے بے چین چہرے
کو دیکھا تو ہمیشہ کی طرح مسکراتے ہوئے مخاطب ہوا! رمضان، یہ کام تمہارے بس کا
نہیں، جاؤ سڑک پر گنے کا رس نکال کر فروخت کرو۔ دوسروں کی مجبوریوں سے ہی اپنی
خوشیاں نچوڑی جا سکتی ہیں۔ خدا نے اتنے لوگ تمہارے پاس بھیجے ہیں تم خدا کی کون
کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔

ابھی وہ باتیں کر رہے تھے کہ رمضان کے کمرے میں چار وکلاء داخل
ہوئے اور آتے ہی شور مچا دیا کہ ہم یہاں کرپشن برداشت نہیں کریں گے، ''آ گئے
انصاف کے ٹھیکیدار'' رمضان کا ساتھی زیرِ لب بڑبڑایا۔ ان چار وکلاء میں سے ایک،
جس کے سر کے بالائی حصے پر برائے نام بال باقی بچے تھے اور تراشی ہوئی داڑھی میں
سفید بال، سیاہ بالوں میں اس طرح نظر آ رہے تھے جیسے دھان کی فصل میں اُگی ہوئی
جڑی بوٹی ہو، آگے بڑھا اور رمضان کو مخاطب کر کے گرجا ''اگر تمہارے جج کو کام کرنا
نہیں آتا تو گھر چلا جائے، یہاں اور بہت ہیں کام کرنے والے۔ رمضان کی حالت
اس مردے جیسی تھی جس کے چاروں طرف لوگ چہرے کے دیدار کے لئے کھڑے
ہوں اور وہ بے پرواہ پڑا ہوا ہو۔ جلدی کرو، فائل نکالو، ایک وکیل غرایا۔ رمضان

کے ساتھی اہلمد نے صورتِ حال کو قابو کرنے کے لئے داڑھی والے وکیل کی آؤ
بھگت شروع کر دی۔ وکیل صاحب غصہ کیوں ہوتے ہیں، ہمیں حکم کریں، ساتھی
اہلمد نے التجا کے لہجے میں کہا۔ رمضان اور ساتھی اہلمد فائل نکال کر وکلاء کے حوالے
کرتے ہیں۔ کمرے میں رش کی وجہ سے وہ وکلاء فائل لے کر باہر چلے گئے اور پھر
رمضان باقی سائلین کی طرف متوجہ ہوا۔ رمضان کو کچھ دیر بعد اپنے بچے کی دوبارہ فکر
ہوئی۔ عدالت کا وقت ختم ہوا اور رمضان جلدی سے سیڑھیاں اتر کر سڑک پر آیا اور
بس میں بیٹھ کر کرشن نگر پہنچ گیا۔ گھر پہنچ کر کھانا کھایا اور پھر بچے کو لے کر ہسپتال چلا
گیا۔ دو دن میں بچے کی حالت سنبھل گئی۔ ایک ہفتہ بعد عدالت نے رپورٹ مانگی
کہ ایک کیس کی پیشی آج کے لئے مقرر تھی لیکن کیس کی فائل عدالت میں پیش نہ ہوئی
ہے۔ رمضان کو رپورٹ کرنے اور فائل پیش کرنے کا حکم ہوا۔ کام کے درمیان جب
بھی -- ملتا، رمضان فائل کو تلاش کرنے میں لگ جاتا۔ پھر اسے یاد آیا، یہ تو وہی
فائل ہے جو اس دن شور مچانے والے وکلاء نے لی تھی۔ رمضان کو تو وکلاء کے ناموں
کا بھی علم نہیں تھا۔ نہ فائل ملی اور نہ ہی ان وکلاء کی شناخت ہو سکی۔ فائل کی گمشدگی کی
رپورٹ ڈسٹرکٹ جج کو بھجوائی گئی اور پھر کچھ دنوں بعد رمضان کی انکوائری شروع
ہو گئی۔ دراصل ایک پارٹی نے درخواست دی تھی کہ ان کی فائل رشوت لے کر گم کر
دی گئی ہے۔

انکوائری شروع ہوئی اور مصیبتوں کا سیلاب امڈ کر رمضان کو ڈبو گیا۔
رمضان نے اپنی بے گناہی کا رونا رویا۔ درخواست گزار کی منت سماجت کی،
سفارشیں لڑائیں لیکن اسے کیا علم تھا کہ ایک مرغے کی قربانی سارے محکمے کی عظمت
اور بقا کے لئے سند ہے۔ اسماعیل تو تھا نہیں کہ بچ جاتا۔ ساتھیوں اور رشتہ داروں
کے کہنے پر مختلف درگاہوں اور درباروں کی حاضریاں رمضان کا معمول بن گیا۔

نوکری گئی تو گھر ایک دن بھی نہ چل پائے گا، رمضان کو یہ فکر کھائے جا رہی تھی۔ یہ نوکری بھی سر سروتی ہے اور سیسی فس (Sisyphus) کی طرح اس نوکری کا بوجھ اٹھانا اس کی قسمت میں لکھا تھا۔ داتا صاحب، کوڑے شاہ، بلیوں والی سرکار اور نہ جانے کون کون سے فقیر تھے جن کے در پر حاضری دی۔ جب بھی امید کا دامن چھوٹنے لگتا، کسی نئے فقیر کی کرامات، احباب کی زبانی معلوم ہوتیں اور امید کا دھاگہ پھر تن جاتا۔ ادھر انکوائری میں شہادتیں قلمبند ہوئیں ادھر رمضان کبھی پرندوں اور کبھی مچھلیوں کو خوراک ڈالتا رہا۔ بیوی کی لڑائی اور باپ کی کھانسی میں دبے ہوئے الفاظ، رمضان کو اپنی شکست کی آمد کا احساس دلاتے رہتے۔ چند سکوں کی تنخواہ کا اتنا بوجھ ہوگا، رمضان نے کبھی سوچا نہ تھا۔ کام کا بوجھ روانی سے رمضان کے کندھوں پر سوار رہا۔ سب اپنی اپنی غرض کے غلام تھے، رمضان کی مدد تو دور کی بات کوئی دفتر میں جھوٹی تسلی بھی دینے کو تیار نہ تھا۔

رمضان کے محلے کے ایک درزی نے رمضان کی پریشانی کو محسوس کرتے ہوئے اسے مشورہ دیا کہ راوی کے پل پر جا کر چیل گوشت خریدے اور دریا کے سپرد کرے۔ رمضان کو اس کی باتوں میں یقین رستا ہوا دکھائی دیا۔ رمضان نے فیصلہ کیا کہ وہ بھی دفتر سے فارغ ہو کر راوی پل جائے گا۔

اگلے دن جب وہ دفتر پہنچا تو اسے انکوائری آفیسر کا پیغام ملا کہ وہ 12 بجے فیصلہ سننے کے لئے پیش ہو۔ 12 بجے جب وہ انکوائری آفیسر کے سامنے پیش ہوا تو انکوائری آفیسر نے حکم سنایا کہ وہ گنہگار ہے اور کیوں نہ اسے نوکری سے برخواست کرنے کی سزا دی جائے۔ جواب کے لئے اگلے دن کی تاریخ مقرر کی گئی۔ رمضان سکوت کی حالت میں جب انکوائری آفیسر کے دفتر کے باہر آیا تو آگے شکایت کنندہ اس وکیل کے ساتھ کھڑا تھا جس نے فائل لی تھی۔ وہ پاؤں گھسیٹتے ہوئے کسی الجھن میں

گرفتار، ان کے قریب سے گزر گیا۔ اب چیل گوشت ہی اس کی آخری امید تھی، وہ سیدھا راوی پل پر ایک رکشے میں بیٹھ کر پہنچ گیا۔ نیچے دریا کے کناروں پر چند کشتیاں بارش کے پانی کے انتظار میں اوندھے منہ لیٹی تھیں۔ جہاں کبھی پانی دریا کی وسعت کا آئینہ دار تھا وہاں اب سوکھی ریت سورج کی تپش میں چمک رہی تھی۔ کامران کی بارہ دری، جہانگیر کا مقبرہ اور دریا میٹھی نیند سو رہے تھے۔ دریا کے پل کے عین وسط میں غلیظ چہروں کے نیچے اڑے ہوئے رنگوں کے کپڑے پہنے مرد اور عورتیں خون میں رنگے ہوئے گوشت کے لوتھڑوں کے شاپر لئے آوازیں لگا رہے تھے۔ پل کے اوپر فضا میں کوے اور چیلیں بول بول کر رینگتی ہوئی گاڑیوں کے شور میں اضافہ کر رہی تھیں۔ رمضان بھی پل کے بیچ میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ سائیکل اور موٹر سائیکلوں پر سوار چند مسافر رک رک کر چیل گوشت خرید رہے تھے اور اپنے سروں کے اوپر گھما گھما کر دریا میں پھینک رہے تھے، جن کے انتظار میں کتے اور چیلیں پہلے سے موجود تھیں۔ سوزوکی مہران سے اتر کر ایک بیمار آدمی بھی یہی مشق کر رہا تھا اور پیچھے آنے والی گاڑیوں کے ڈرائیور اوور ٹیک کرتے ہوئے اس بیمار آدمی کو گھورتے ہوئے بڑبڑا رہے تھے۔ غریبوں سے چرا کر خدا کو ادھار دینے والے امیر آدمی بے رخی سے گزر رہے تھے۔ غریبوں کا خدا بھی شاید غریب ہوتا ہے جس کے پاس غریبوں میں بانٹنے کے لئے کچھ بھی نہیں ہوتا۔

رمضان نے ایک عورت سے چیل گوشت کے دو شاپر دو سو روپے میں خریدے۔ ایک شاپر اس نے اپنے سر کے گرد گھما کر دریا میں پھینک دیا اور دوسرا شاپر لیے ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ کدھر پھینکے کہ ایک موٹر سائیکل پر سوار آدمی اس کے سامنے رکا اور چیل گوشت کا شاپر رمضان کے ہاتھ سے لیتے ہوئے اسے پانچ سو کا نوٹ تھما دیا۔ رمضان حیران وہاں کھڑا رہا۔ دو روپے بچانے کے لئے تکرار کرنے

والے، یہاں قیمت کے معنی سے ہی نا آشنا نظر آتے ہیں۔ رمضان 500 روپے تھامے واپس گھر چلا آیا۔ اسے یقین تھا کہ چیل گوشت کے وارنے سے اس کی مصیبت ٹل جائے گی۔ اگلے دن انکوائری آفیسر نے جواب وصول کر کے رمضان کو نوکری سے فارغ کرنے کا فیصلہ سنایا۔ باہر سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے رمضان نے اوپر دھواں اور گرد سے اٹے آسمان کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں پانی آگیا جس سے سامنے کا منظر دھندلا ہو گیا۔ اس نے ایک گھونٹ بھرا۔ آنکھ کا پانی، گلے میں رس گیا تھا۔ رمضان کے ماضی کو اس رات کے اندھیرے نے اپنی پناہ میں لے لیا۔ اگلی صبح وہ قصائی سے چیل گوشت خرید کر راوی کی طرف چل پڑا۔

☆......☆

زمین کی قیمت

اشرف نے اپنی ساری زندگی ایمانداری سے گزاری تھی لیکن وقت شاید ایماندار نہیں رہا تھا۔ پیشے سے وہ موچی تھا اور نسل در نسل جوتوں کی مرمت کا ہنر اس تک پہنچ کر اٹک گیا تھا۔ نائی، موچی، کمہار اور دوسرے کم ذات لوگوں کے پیشے اپنی موت آپ ہی مر رہے تھے۔ گاؤں کی زندگی اتنی تیزی سے بدلی کہ پرانے جوتوں کی مرمت قصہ پارینہ بن گیا۔ جب جوتوں کی مرمت نہیں ہوئی تو گاؤں کے لوگ کا تک اور بیساکھ کی فصل کا حصہ کیوں کر اشرف کو دیتے۔ جوتوں کا انتظار کب تک کیا جا سکتا تھا آخر اپنے ہی ہنر کو اپنے اوزار کے ہمراہ ایک ٹوٹے بکس میں بند سلاسل کے بعد اشرف نے اپنے گھر کے ایک کمرے کا دروازہ گلی میں کھول کر دکان کی شکل دی۔ گاؤں میں اگرچہ پیشے کا بدلنا اپنی ہی عزت سے کھیلنے کے برابر تھا لیکن یہ عزت کا کھلواڑ اشرف جیسی قوم کے لئے بڑی بات نہ تھا۔ اشرف نے چند دنوں میں اپنی اور ادھار کی رقم سے چینی، دالیں، گھی، سبزیوں اور دوسری ضروری چیزوں سے دکان کے کونوں کو سجا دیا۔ رقم تو خاصی خرچ ہو گئی تھی لیکن پھر بھی دکان کونوں کے علاوہ خالی خالی نظر آتی تھی۔ وہ روزانہ نزدیک شہر سے سائیکل پر سودا لے کر آتا اور اس کے پیچھے اس کی بیوی دکان چلاتی۔ دو چھوٹے بچے جن کی عمریں دس سال سے کم تھیں گاؤں میں دوسرے بچوں کے ہمراہ کھیل کر گھر آتے تو ماں سے ٹافیوں کی فرمائش کرتے۔ ماں اپنی محبت میں ایک

ہاتھ سے ایک ایک ٹافی دیتی اور دوسرے ہاتھ سے مارنے کا اشارہ کرتی کہ خبردار اب اگر دوبارہ کوئی چیز مانگی۔ بچے خوشی اور ڈر کے ملے جلے جذبات سے گھر کے اندر پڑی ہوئی گیلی مٹی سے چھوٹے چھوٹے برتن اور جانور بنانے میں مشغول ہو جاتے۔ اشرف کی زندگی دن بدن بدلنے لگی۔ روزانہ کا منافع چاہے تھوڑا ہی ہوتا لیکن دونوں میاں بیوی، دیوں اور سکوں کو بار بار گنتے اور ان کا لمس ایک عجیب خوشی دیتا جس کا احساس انہیں پہلے کبھی زندگی میں نہ ہوا تھا۔ جس گھر میں اناج چھ مہینے بعد آتا تھا اس گھر میں اب بٹوے کا پیٹ پھولنے لگا تھا اور سکوں کی تھیلی کا بڑھتا بوجھ سحر طاری کرتا تھا۔

چھ مہینوں میں ہی اشرف نے اپنا قرضہ اتار دیا۔ اگرچہ اس نے اپنا پیشہ بدل لیا تھا اور گاؤں کے کسی چودھری کا مرہون منت نہیں تھا لیکن پھر بھی اس کے ہاتھ تعظیم کے لئے اٹھ جاتے تھے۔ لوگ اب بھی اسے ٹوٹے ہوئے جوتوں کی ابھری ہوئی تہہ کے ساتھ بیٹھا ہوا اشرف موچی ہی تصور کرتے تھے اور وہ خود بھی اس تصور کی جمی ہوئی مٹی کی تہہ کے رنگ کو بدلنے کے خیال سے عاری تھا۔ گاؤں میں وقت بدل رہا تھا، پہناوے بدل رہے تھے اور پیشے بھی بدل رہے تھے۔ اشرف کی دکان کے اندر جگہ کم رہ گئی تھی اور سامان زیادہ آ گیا تھا۔ ایک سال میں ہی اشرف اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ وقت کیوں اور کیسے بدل جاتا ہے، اس خیال سے بے پرواہ اشرف گرمیوں کی ایک شام کو اپنی دکان میں بیٹھا ہوا تھا۔ گاؤں کے دو تین آدمی بھی حقے کے کش لگانے کیلئے ادھر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ دھان کی فصل کے، بارش نہ ہونے کی وجہ سے، نقصان پر خدا سے شکوے شکایت میں مصروف تھے کہ اتنی دیر میں چوہدری یار محمد نمبردار کا گھریلو ملازم اللہ رکھا آ گیا اور اشرف سے کہنے لگا کہ تمہیں چوہدری صاحب ابھی بلا رہے ہیں۔ اشرف پوچھنے لگا کہ خیریت تو ہے ناں؟ اللہ رکھا نے جواب دیا کہ مجھے بات کا تو علم نہیں البتہ ابھی آنے کا کہا ہے۔ اشرف اپنی دکان میں بیٹھے ہوئے ہمسائے کو دکان سونپ کر اللہ رکھا کے ہمراہ نمبردار کے ڈیرہ پر آیا۔ اشرف

سلام کرنے کے بعد ایک چارپائی پر بیٹھ گیا۔ حقے کی نلی دو تین بیٹھے ہوئے آدمیوں کے منہ میں گڑگڑ کی آواز کے ساتھ دھواں بھرتے ہوئے اشرف کے منہ کے سامنے آ کر رک گئی۔ اشرف نے حقے کی نلی کو ہاتھ کی مٹھی میں دبا کر سانس اندر کھینچا تو حقے کی گڑگڑ کے ساتھ تمباکو کا تیز مزہ حلق تک پہنچ گیا۔ تمباکو کا اپنا ہی مزہ ہے کہہ کر اشرف حقے اور تمباکو کی تعریف کرنے لگا۔ پھر چوہدری یار محمد نمبردار سے فصل کا دریافت کرنے کے بعد اشرف نے کہا جی نمبردار صاحب میرے لئے کیا حکم ہے۔ چوہدری یار محمد نمبردار نے ایک وقفے کے توقف کے بعد اشرف سے استفسار کیا کہ دو ماہ قبل گندم کی کٹائی کے موسم میں تم نے چوہدری عاشق کے بیٹے اچھی اور بلو کمہار سے تین بوریاں گندم خریدی تھی۔ اشرف نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد بغیر کسی پریشانی کے جواب دیا کہ ہاں انہوں نے مجھے گندم فروخت کی تھی اور کچھ ادھار کی رقم چکانے کے بعد بقیہ رقم نقد وصول کر لی تھی۔ اشرف نے فوراً ہی نمبردار سے پوچھا کہ سب خیریت ہے؟ نمبردار نے جواب دیا کہ ہمیں کچھ شک ہے اور کل اچھی اور بلو کو بلوایا ہے، تم بھی آ جانا۔ اشرف جی اچھا کہہ کر وہاں سے چل دیا۔ واپس دکان پر پہنچ کر اشرف نے اپنے ہمسائے امام دین کو ساری بات بتائی جواب وہاں اکیلا ہی حقے کی آخری گرم سانسوں کو اپنی سانسوں میں ملا رہا تھا۔ امام دین نے اسے بتایا کہ میں نے سنا ہے یار محمد نمبردار کی گندم کسی نے چوری کی تھی لیکن چوروں کا علم نہ ہو سکا تھا۔ اشرف نے اپنے آپ کو تسلی دینے کے لئے کہا کہ مجھے کیا، میں نے کونسی چوری کی ہے۔ میں نے تو پوری رقم ادا کرنے پر ہی گندم خریدی تھی۔ ”جنہوں نے گاجریں کھائیں، انہیں کے پیٹ میں درد ہوگا“ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

اگلے دن اشرف شہر سودا سلف لینے کی بجائے چوہدری یار محمد نمبردار کے ڈیرہ پر چلا گیا۔ ڈیرہ میں گاؤں کے کافی لوگ بیٹھے تھے۔ اچھی اور بلو کمہار بھی موجود تھے۔ اچھی بگڑی ہوئی عادتوں والا لڑکا تھا اور بلو کمہار تو گویا چودھری اچھی کی سوچ اور حرکات

کے زیر اثر کسی دوسری سمجھ بوجھ سے منحرف تھا۔غلامی بھی محبت کا پرتو لیے اندھے پن کا سوانگ بھرتی ہے۔لوگوں کی نظریں کاربن پیپر کی طرح اٹھیں تو نیچے لکھے ہوئے حروف وہ چور آ گیا، وہ چور آ گیا کا شائبہ اشرف کو ہونے لگا۔رات سے شروع ہونے والی چہ مگوئیوں سے بننے والے تصویری کینوس سے باہر نکلتی دکھائی دے رہی تھی۔ چند سوال جواب کے بعد اشرف کو معمولات زندگی کی بہتی ندی میں مدھم دکھائی دینے والی ذات پات کی لکیریں گہری اور پاٹ دار ہوتی نظر آئیں۔اشرف سر سے پاؤں تک پسماندگی کا مجسمہ بنے سوچ رہا تھا کاش میں نے گندم نہ خریدی ہوتی، برا ہو! لیکن مجھے کیا علم تھا یہ چوری کی گندم ہے۔احساس جرم، بے گناہی اور ناانصافی کے خیالات ایک دوسرے کی جگہ بدل بدل کر اسے الجھا رہے تھے۔وہ تھک گیا تھا، چھپ جانے یا بھاگ جانے پر اس کا دل مائل تھا۔گاؤں کے معززین کے فیصلے میں اشرف کے سچ کو جھوٹ گردانتے ہوئے جرمانے کا اعلان کیا گیا تاکہ آئندہ کسی کو چوری کا مال خریدنے کی جرأت نہ ہو۔ ٹھیک ہی تو ہے، جب کوئی چوری کا مال نہیں خریدے گا تو بھلا چوری کیسے ہو سکتی ہے۔ اچھی اور بلو کمہار کا معاملہ نمبردار کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا کہ وہ خود اس کو دیکھ لیں گے۔ لوگوں کی دبی دبی آوازوں میں چور، چور کے الفاظ، اشرف کو اپنے اندر ہونے والے چور چور کے شور میں دبتے ہوئے محسوس ہوئے۔کاروبار بھی گیا عزت بھی گئی۔

کھیتی باڑی کے نئے آلات اور شہر کے بازار سے تعلق نے کسانوں کا اپنے کمیوں سے تعلق کمزور کر دیا تھا۔گاؤں میں کسانوں کی نئی نسل نے اپنے باپ دادا کی وہ زمین جو کمیوں کے قبضہ میں تھی اس کو واپس لینے کا کام شروع کر دیا تھا۔اشرف جیسے نیچ ذات کے دوسرے افراد کے باپ دادا کی غلامی اور خدمت تو اب پہچاننے والے کہیں قبروں میں خاموش پڑے تھے۔اگر زندہ بھی ہوتے تو بھلا غلامی کا مول کسی نے کبھی مانگا ہے۔اشرف ملکیت کے حق سے ناآشنا تھا۔اس کے گھر کی جگہ بھی نمبردار

کے رشتہ دار کی ملکیت تھی۔

اشرف اپنی دکان کو تالا لگا کر جب رات کو چارپائی پر بیٹھ کر کھانا کھانے لگا تو اس کی بیوی نے بتایا کہ محلے کے اپنے برادری والے قیمت چکا کر گھروں کی زمین خرید رہے ہیں۔تم بھی کچھ سوچو، اگر یہاں سے اٹھنا پڑا تو کہاں جائیں گے۔اشرف نے پریشانی سے جنم لینے والے غصے میں بیوی کو جھاڑ پلا دی اور بولا کہ دیکھا جائے گا، جب اوپر والا موجود ہے تو کچھ نہ کچھ تو ہو گا۔

ان دنوں بارشوں سے آنے والی کاتک نے نزدیکی دریا کے اندر بسنے والے لوگوں کو کناروں سے باہر پھینک دیا، چھت، اناج اور گنے چنے مویشیوں میں سے آدھے تو پانی ساتھ بہا لے گیا۔دریا کے بند پر موجود انسان اور جانور تیز بہتے ہوئے گدلے پانی کو غصے سے دیکھ رہے تھے۔اتنے میں ریاض بیلدار اور اشرف سائیکل پر بیٹھ کر وہاں آن پہنچے۔ریاض، اشرف کا بچپن کا دوست تھا اور آج وہ اشرف کو خاص مقصد کے لئے لے کر آیا تھا۔سیلاب سے متاثر لوگوں کی مدد کے لئے ڈپٹی کمشنر صاحب آ رہے تھے۔پٹواری، بیلدار اور دوسرے چھوٹے سرکاری ملازم وہاں انتظام کے لئے آئے تھے۔سینکڑوں متاثرہ لوگوں کی لسٹ بنائی جاتی تھی۔ان کی مالی مدد کے علاوہ گھروں کے لئے جگہ کا انتظام بھی حکومت نے اپنے ذمے لینے کا اعلان کیا تھا۔ڈپٹی کمشنر نے علاقے کا دورہ کیا تو علاقے کے بڑے زمیندار بھی ان کے ساتھ تھے۔ڈپٹی کمشنر نے ہر خاندان کے لئے 15 ہزار کی مالی امداد کا اعلان کیا اور بند کے ساتھ پھیلی ہوئی بنجر زمین، جو اِن بڑے زمینداروں کی ملکیتیں تھی، پر اپنے مکان بنانے کی اجازت دے دی۔دریا سے واپس آتے ہوئے اشرف بہت خوش تھا اور اپنے دوست ریاض کا شکر گزار تھا۔اس کا نام سیلاب سے متاثرہ لوگوں کی فہرست میں شامل تھا۔

☆......☆

دیسی شراب

جون کے مہینے کی سخت گرمی میں افق پر گرد کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ شام نے سورج کو اپنے اندھیروں کے پیٹ میں جذب کرنے کے لئے منہ کھول لیا تھا۔ پیاس اور بھوک سے لاغر اجسام مغرب کے کناروں پر نئے چاند کی آمد سے مایوس ہوکر گھروں کو لوٹ چکے تھے۔ اس دفعہ بھی روزے تیس ہوں گے۔ گلیوں اور بازاروں میں رویت ہلال کمیٹی کے چاند نظر نہ آنے کے اس اعلان کو گرد آلود فضا، کمیٹی کے ارکان کی ناقص بینی اور حکومتی سازش سے تعبیر کیا گیا۔

ان سب باتوں سے بے نیاز یوسف اور دارا مسلم شیخ نے گاؤں سے دور تپتی ہوئی زمین کی تہہ میں دبے ہوئے گھڑے کو نکال کر اس کے منہ پر بندھی ہوئی پٹی اتاری تو تیز بو یوسف اور دارا کی سانسوں میں شامل ہوگئی۔ دونوں کے چہروں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ اور آنکھوں کی چمک سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ بھانڈا پک کر تیار ہوگیا ہے۔ یوسف نے دارا مسلم شیخ کے مشورہ اور مدد سے گڑ، پھل، کیکر کے جسم کی ابھری ہوئی کھال (چھال) کے شیرے کو بوجہ احترام رمضان پہلے روزہ سے قبل ہی سپرد زمین کر دیا تھا۔ وہ دونوں مٹی کے گھڑے کو وہاں موجود واحد کمرے میں لے گئے، کمرے کے اندر سوکھی لکڑی سے آگ جلائی گئی، گھڑے کو آگ پر رکھ کر اڑتی ہوئی بھاپ کو مقید کر کے قطروں کی شکل میں ایک برتن میں اکٹھا کیا جانے لگا۔ جہاں ایک

قطرہ برتن میں گرتا وہاں گرمیوں میں کمرے کے اندر لگی آگ نے یوسف اور دارا کے جسم سے پانی کے قطرے نچوڑنے شروع کر دیئے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کے جسم کے اندر کی برف اس حرارت سے پگھل کر پانی کی شکل میں ٹپک کر کپڑوں کو گیلا کر رہی ہے۔ یوسف کے منہ سے کئی بار دارا کو مخاطب کرتے ہوئے یہ الفاظ نکلے! ''اللہ کرے اب یہ صحیح کشید ہو جائے''۔ دارا کی سائنسی تربیت اور یوسف کی بے ساختہ دعاؤں سے دو گھنٹے کے بعد دو بوتلیں دیسی شراب کشید ہوگئی اور غالباً اتنا ہی پانی ان کے جسموں سے بہہ کر کپڑوں کو تر کر چکا تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں دونوں بوتلوں کو سوکھی لکڑیوں اور بکھری گھاس کو اکٹھا کر کے چھپا دیا گیا۔ یوسف اور دارا جب کمرے سے باہر آئے تو ہلکی ہوا کے لمس نے ان کے جسموں میں کپکپی طاری کر دی۔ دونوں رات کے اندھیرے میں واپس گھر آ گئے۔ انہیں ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا جیسے جنگ کے بعد فوجی مال غنیمت لے کر واپس آتے ہیں۔ تاروں کی کڑھائی والے کھلے آسمان کے نیچے چارپائی پر لیٹے یوسف کے دماغ میں یہ بات گونج رہی تھی کہ اب عید منانے کا مزا آئے گا اور یہ گونج صرف وہی سن سکتا تھا۔

آخری روزہ گزر گیا، چاند رات آئی اور عید کی خوشی کا اثر ہوا میں جیسے ساکن ہوگیا تھا اور اس اثر کو سب نے یکساں محسوس کیا۔ اگلی صبح عید کی نماز کے وقت کا، سپیکر پر جیسے ڈھنڈورا پیٹا گیا۔ سب لوگ آٹھ بجے مسجد میں تشریف لے آئیں جماعت ٹھیک آٹھ بجے کھڑی ہو جائے گی۔ امام مسجد بار بار سپیکر پر لوگوں کو تاکید کر رہے تھے۔ آج سب کچھ ہی مختلف تھا۔ نماز بھی سورج نکلنے کے بعد۔ حجام کی قینچی اور استرا نے پوری کوشش کی کہ تمام افراد ایک جیسے حلیے میں ڈھل جائیں۔ آج تو سب لوگ ہی نہائے تھے اور کپڑے بھی بغیر سلوٹوں کے پہنے تھے۔ یوسف بھی نئے حلیے میں لوگوں کے پیچھے پیچھے مسجد کی طرف چل پڑا اور دل ہی دل میں شرمندگی محسوس کر رہا تھا کہ وہ خدا کے گھر

سال میں دو دفعہ ہی حاضر ہوتا ہے۔ اسے یہ شرمندگی کئی دوسرے نوجوانوں کے چہروں پر بھی چھپی دکھائی دی۔ جماعت کھڑی ہوئی تو یوسف نے اپنی آنکھوں کے کونوں سے چوری چھپے رکوع اور سجدے میں جاتے ہوئے دوسرے لوگوں کو دیکھا اور عید کی نماز مکمل کی۔ پھر مولوی صاحب نے جب اپنی تقریر کے دوران کئی دفعہ کہا ''کہو سبحان اللہ'' تو یوسف نے اس گرجتی ہوئی آواز کے طلسم میں ہر دفعہ ''سبحان اللہ'' کہا۔ خطبہ ختم ہوتے ہی یوسف جیسے دوسرے نوجوان اور بچے مسجد سے ایسے بھاگے جیسے بکرا قصائی کی گرفت سے چھوٹ کر بھاگتا ہے۔ دوستوں، رشتہ داروں سے عید ملن کے بعد یوسف گھر واپس گیا اور مختلف انواع کے کھانوں کو دیکھ کر ہی اس کی بھوک ختم ہوگئی۔ تھوڑا بہت کھانا چکھنے کے بعد وہ دارا کی تلاش میں نکل پڑا۔ دارا کو تلاش کر کے وہ سیدھا اس کمرے میں گیا جہاں کونے میں دونوں بوتلیں ابھی بھی ان کا انتظار کر رہی تھیں۔ یوسف اور دارا، ایک بوتل نکال کر ٹیوب ویل کے تالاب کے کنارے بیٹھ گئے۔ کڑوے کسیلے پانی کے چند گھونٹوں نے طبیعت میں شادابی اور روانی پیدا کر دی۔ باتوں باتوں میں یوسف نے دارا کو بتایا کہ سال کے بعد جب چند قطرے رگوں میں سفر کرتے ہیں تو گویا زندگی سہانی لگتی ہے، ورنہ ہم میں اور بھینسوں کی زندگیوں میں زیادہ فرق نہیں۔ پتہ نہیں ہم خوشی کا ہر کام چوری چھپے ہی کیوں کرتے ہیں۔ دارا نے جواب دیا کہ آج تو سب نے اپنا اپنا بندوبست کیا ہوا ہے لیکن سب اجنبی بنے ہوئے ہیں۔ یوسف نے جب سٹیل کے گلاس کے تین پیگ چڑھا لیے تو اس کے اندر کی چھپی ہوئی محبت کی داستان زباں پر رواں ہوگئی۔ مٹی کے اس گھروندے میں چند گھونٹوں نے محبت کا دریا بہا دیا لیکن اس دریا کی لہریں اپنے ہی کناروں سے ٹکرا کر ہمیشہ واپسی کا سفر شروع کر دیتیں۔ شادابی کا یہ منظر بیرونی دنیا سے کٹا ہوا تھا کہ اچانک تاریک وردیوں اور بوٹوں میں الجھے ہوئے چند اجسام یوسف اور دارا کے قریب آ کر کھڑے

ہوگئے۔ ان کے ہونٹوں کے تبسم نے یوسف اور دارا کے چہروں کی مسکراہٹ اور دلوں کی شادابی اچانک چھین لی۔ ان کے نئے کپڑوں کے گریبان جب پسینے والے ہاتھوں میں آئے تو زندگی کی سلوٹیں اس ایک دن کی تازگی بھی برداشت نہ کر سکیں۔

دارا کے منہ سے ہلکی سی آواز آئی! ''پولیس''

ہم ماتم تو بازاروں میں کرتے ہیں، لیکن آزادی اور خوشی کے چند لمحات اکیلے بھی نہیں منا سکتے۔

عید تو منا لی اور کرنا بھی کیا تھا۔ دن کا باقی وقت اور رات تھانہ کی حوالات میں کاٹی۔ اسلامی قوانین کے تحت پرچہ کاٹا گیا اور اگلے دن مجسٹریٹ کی عدالت میں حاضری کے بعد یوسف اور دارا کو جیل روانہ کر دیا گیا۔ پولیس کی گاڑی جیل کے اندر داخل ہوئی تو آگے ایک کھلا میدان تھا۔ اس میدان کو عبور کر کے گاڑی لوہے کے بنے دیوہیکل گیٹ کے آگے کھڑی ہوگئی، جو کسی قلعہ کا دروازہ محسوس ہوتا تھا۔ اس بڑے دروازے میں ایک کھڑکی لگی ہوئی تھی جس کے ذریعے ملزمان اور پولیس کے تین آدمی اندر داخل ہوئے۔ اندر کھڑے سپاہی جن کے کندھوں پر 303 رائفل لٹک رہی تھیں، نے یوسف، دارا اور دوسرے ملزمان کو وصول کیا اور پھر ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گئے جہاں ان کی کیمرہ سے تصویریں لی گئیں اور رجسٹر کے اندر نام، ولدیت قوم، پتہ درج کرنے کے بعد، تھانہ اور جرم کا بھی اندراج کیا۔ یوسف، دارا اور دوسرے ملزمان کو الگ الگ کارڈ دیئے گئے جن پر رجسٹر میں درج معلومات منعکس تھیں، یہ کارڈ یوسف اور دارا کو ہمراہ دیگر ملزمان ایسے تھما دیئے گئے جیسے عربی دوسرے ملکوں سے آئے ہوئے مزدوروں کو اقامہ تھماتے ہیں۔ یوسف اور دارا کا نشہ تو اتر چکا تھا لیکن سر میں ہلکا ہلکا درد اب بھی موجود تھا جو اس اجنبی میوزیم میں ساری ضابطہ کی کارروائی سے لاتعلقی پیدا کر رہا تھا۔ دارا اور یوسف ہاتھوں میں کارڈ تھامے دو سپاہیوں

کے پیچھے پیچھے کئی چھوٹے کمروں کے سامنے سے گزرے جن کے اندر قیدی مقید
تھے۔ یوسف کو ایسے لگا جیسے وہ چڑیا گھر کے اندر داخل ہو گیا ہے۔ دونوں سپاہی کچھ دیر
چلنے کے بعد دائیں طرف کے دروازے کو کھول کر اندر داخل ہوئے تو یوسف اور دارا
نے بھی دروازہ کی دہلیز عبور کی۔ آگے ایک بڑا سا ہال جس کے اندر قیدی مکھیوں کی
طرح بھنبھنا رہے تھے۔ یہ قیدی ریلوے اسٹیشن پر پڑے مسافروں کی طرح کسی چیز
کے انتظار میں تھے۔ اس امید کے انتظار میں جو ٹرین کی طرح ہمیشہ لیٹ آتی ہے۔
یوسف اور دارا دب کی بنی چٹائی پر خالی جگہ دیکھ کر قابض ہو گئے۔ دوسرے قیدیوں
نے متجسس نگاہوں سے دارا اور یوسف کو دیکھا۔ یوسف اور دارا بھی ڈگمگاتے اعتماد
سے ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ کچھ ہی دیر میں سارے قیدیوں کو علم ہو گیا کہ شرابی آئے
ہیں۔ یہ ہال کلیسا کے اعتراف گناہ والے کمرے کی طرح تھا جہاں ہر ملزم کا سچ گونج
رہا تھا۔ یوسف اور دارا جہاں بیٹھے تھے وہاں سے چند گز کے فاصلہ پر ایک کونے میں
لمبے بالوں والا کلین شیو آدمی جو پچاس سال کے لگ بھگ عمر کا تھا، دیوار سے ٹیک
لگائے بیٹھا تھا اور اس کے آگے دس بارہ قیدی چوکڑی ڈالے اس کی تقریر سن رہے
تھے۔ یوسف بھی ادھر دیکھنے لگا جیسے وہاں کوئی مداری تماشہ لگائے بیٹھا تھا۔ کچھ نامکمل
فقرے یوسف کے کانوں میں پڑے۔ مجھے خوف......ریاست سے۔ اس نے
تانے......اردگرد ہالے۔ کچھ نظر نہیں آتا۔ یوسف نے جب کوشش کر کے سنا تو وہ لمبے
بالوں والا کلین شیو آدمی کہہ رہا تھا، ''ہاں کچھ خواب ہیں کہ ان سے آگے دیکھ سکوں
جیسے بحراوقیانوس کے کنارے کھڑے ہو کر پندرہویں صدی کے لوگ پانیوں سے
آگے کی دنیا کے خواب دیکھتے تھے۔ ہمارا ضمیر بھی تو ریاست کے بنائے ہوئے نیکی اور
بدی، سچ اور جھوٹ کے تصور سے جنم لیتا ہے۔ ہمارے والدین فطرت سے ڈرتے
تھے، ہم ریاست سے ڈرتے ہیں۔ ایک لاوا ہے جو میرے اندر پکتا ہے لیکن باہر نکلنے

سے ڈرتا ہے۔ وہ میرے ہی وجود کو جلاتا ہے اور ہر دفعہ میرے آنسو ہی اس کی حدت کو
کم کرتے ہیں۔ میں ہجوم میں جاتا ہوں تو کووں کی آوازیں مجھے تنہائی کی طرف
دھکیلتی ہیں۔ تنہائی سے تھک کر کہاں جاؤں۔ سمندر کے کنارے، جنگل کے گھنے
سائے یا پھر خلا میں، ہر جگہ تو ریاست ہے۔ یہ ریاست تو خدا سے بھی بڑی لگتی ہے جو
خدا کی طرح انسان اور اس کی آزادی سے حسد کرتی ہے۔''

ہال کے اندر ایک سپاہی اچانک نمودار ہوتا ہے۔ کونے میں بیٹھے ہوئے
قیدی جو لمبے بالوں والے شخص کی نہ سمجھ آنے والی باتوں کو سن رہے تھے، آہستہ آہستہ
اٹھنے لگے۔ سپاہی کو محسوس ہوا جیسے لمبے بالوں والا شخص ممبر والا وعظ سنا رہا ہے یا پھر
روحانیت کا درس دے رہا ہے۔ سپاہی نے ہال کے دو چکر کاٹے اور درمیان میں کچھ
قیدیوں کی بکھری ٹانگوں کو اپنے بوٹوں کی چوٹ اور زبان کی کاٹ دار آواز سے سیدھا
کیا۔ یوسف اور دارا بیٹھے سوچ رہے تھے کہ گاؤں والوں کو اب علم ہو چکا ہو گا اور اس
احساس سے ان کے چہروں کی رنگت اُڑی جاتی تھی۔ ابا اور چچا تو میری جان نکال
دیں گے، یوسف کے دماغ میں یہ بات اٹک کر رہ گئی تھی۔ دارا یار! میں نے کبھی سوچا
نہیں تھا کہ پولیس ہمیں گرفتار کر لے گی اور پورے گاؤں میں بے عزتی ہو گی۔ یوسف
نے دارا کو دیکھے بغیر، فرش پر نظریں جمائے، بات کی جیسے یہ سوال بھی ہو اور خیال کا
اظہار بھی۔ پاس لیٹے ہوئے ایک شخص نے اپنی مونچھوں کو ہاتھوں کی انگلیوں سے
دباتے ہوئے یوسف کو مخاطب کیا، چودھری! پریشان کیوں ہوتا ہے کل سیشن جج
صاحب آئیں گے اور تمہاری ضمانت ہو جائے گی۔ یہ بھلا کون سے بڑا جرم ہے۔

یوسف اور دارا یہ بات سن کر ایسے خوش ہوئے جیسے انہیں بوتل واپس مل گئی
ہو۔ سوچتے، باتیں کرتے، دوسروں کی سنتے، اپنی سناتے شام ہو گئی۔ لنگر کی قطار میں
لگ کر یوسف اور دارا نے جب کھانا دیکھا تو انہیں گرفتاری کے بعد پہلی دفعہ بھوک کا

احساس ہوا۔ عید کی مناسبت سے جیل کے کھانے میں چکن قورمہ اور حلوہ تھا جسے کھا کر دارا کے ذہن میں خیال آیا کہ یہ پہلا کھانا ہے جو بغیر مزدوری کے مل رہا ہے۔ مچھر اور گرمی تو کوئی ایسی خاص وجہ نہیں تھی جس سے نیند نہ آتی البتہ جیل کے احساس نے یوسف کی نیند اڑا دی تھی۔ دارا نے یوسف کی ٹانگیں دبا کر اور باتیں سنا کر رات کو رخصت کیا۔

اگلے دن تمام بیرکوں میں یہ اطلاع دے دی گئی کہ سیشن جج صاحب جیل کے دورے پر آئیں گے اور چھوٹے جرائم کی ضمانتیں بھی لیں گے۔ سپاہیوں نے قیدیوں کو سختی سے منع کیا کہ کوئی جیل انتظامیہ کے خلاف شکایت نہیں کرے گا۔ شکایت کے انجام سے بھی انہیں آگاہ کر دیا گیا۔ یوسف اور دارا نے باقی قیدیوں کے ساتھ مل کر صفائی کی اور پودوں کو پانی لگایا۔ جیل بھی عید کے رنگ میں رنگ دی گئی تھی۔ یوسف اور دارا باقی قیدیوں کی طرح اپنے اقامے جیسے کارڈ کو تھامے بیٹھے تھے۔ اچانک یوسف کو خیال آیا کہ کیوں نا لمبے بالوں والے شخص سے رسم وراہ کی جائے۔ وہ لمبے بالوں والا پڑھا لکھا سیاسی لیڈر لگتا تھا۔ جیل کی دوستی کا رنگ کبھی پھیکا نہیں پڑتا۔ یوسف نے یہ سن رکھا تھا۔

یوسف اور دارا سلام کہہ کر لمبے بالوں والے شخص کے پاس بیٹھ گئے۔ باتوں باتوں میں انہیں معلوم ہوا کہ لمبے بالوں والے شخص کا نام سرمد ہے، جس کے خلاف ثقافت کی آڑ میں مختلف گروہوں کے مابین عداوت کو ہوا دینے کا مقدمہ درج تھا۔ سرمد کے پوچھنے پر یوسف نے بتایا کہ ان کے خلاف شراب تیار کرنے اور پینے کا مقدمہ درج ہے۔ سرمد نے بے ساختگی سے کہا، اچھا شراب! خطہ اسلام کا نہ تھکنے والا مسافر، شیراز واصفہان کا استنبول کی سرائے میں بکنے والا اعلیٰ مشروب، بادشاہ سلیمان اور حورم سلطان کے بیٹے سلیم کا سائپرس کا بنا خزانہ۔ مغل بادشاہوں کے لئے چاول

سے بنا عرق، یہ دارو نام ہی برا ہے۔ عرق کتنا دلکش نام ہے۔

سرمد نے راز داری کے لہجے میں حیرت زدہ یوسف اور دارا کو بتایا کہ عظیم مغلوں کا کچھ ذریعہ آمدنی تو افیون تھی، جو بنگال کی فتح کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ آئی اور پھر بعد میں پورا ہندوستان فتح ہوا۔ یوسف اور دارا کو تو اپنے گاؤں کی تاریخ کے علاوہ صرف اس تاریخ کا علم تھا جو مسجد کے امام پچھلے 25 سال سے دہرا رہے تھے۔ سرمد کی باتیں تو انہیں عجوبہ لگ رہی تھیں۔ جہاں یہ عرق نہ پہنچایا، اس پر پابندی لگا دی گئی، وہاں چائے نے اپنا قبضہ جما لیا۔ سرمد نے یہ حتمی رائے دیتے ہوئے اپنے زانوں پر ہاتھ مارا اور پھر شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ مجھے تو سمجھ میں نہیں آتا، جب سے عرق پر پابندی لگی ہے، زمینوں پر قبضے کیوں ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ مؤسیقار اور گلوکار ملک سے باہر گئے، یہاں گلے کٹنا شروع ہو گئے۔

سیشن جج صاحب کے آنے سے قبل ہی سرمد کو ایک علیحدہ کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا تا کہ اس کی باتوں سے کوئی مصیبت کھڑی نہ ہو جائے۔ دوسرے قیدیوں سے وابستگی کی وجہ سے اس کا میل جول بھی ختم کر دیا گیا۔ تقریباً بارہ بجے سیشن جج صاحب کے آنے سے قبل ہی چھوٹے جرائم میں ملوث ملزمان کی لسٹ تیار ہو چکی تھی۔ بیرکوں کا چکر کاٹنے اور باورچی خانہ کا کھانا چیک کرنے کے بعد سیشن جج صاحب جیل کے اندر قائم کردہ عدالت میں تشریف لے آئے۔ وہاں ملزمان قطاروں میں فرش پر بیٹھ جمائے بیٹھے تھے۔

یوسف اور دارا بھی ایک قطار میں آخری دو ملزمان کے آگے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ سیشن جج صاحب کو چہرے پر ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے، سیشن جج صاحب پچپن اور ساٹھ سال کی بیچ عمر کے دبلے پتلے، باریش انسان تھے۔ چہرے سے روح کی سختی عیاں تھی۔ چوری، جوا اور قتل کی دھمکیوں میں ملوث ملزمان کو جب شخصی ضمانت

پر رہا کرنے کا حکم سنایا گیا تو یوسف بھی جیل سے نکل کر بس میں سوار ہو کر گاؤں جانے کا سوچنے لگا۔ سوچ کا سلسلہ اس وقت ٹوٹا جب یوسف اور دارا کے نام پکارے گئے۔ دونوں کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں اور وہ اپنے قدموں پر کھڑے ہو گئے۔ دونوں نے اپنے ہاتھ آگے کی طرف ناف پر باندھ رکھے تھے۔ سیشن جج نے کراہت بھری نظروں سے دونوں کی طرف دیکھا تو دونوں نے خوف محسوس کرتے ہوئے اپنی نظریں نیچی کر لیں، ''تمہیں علم نہیں شراب پینا کتنا بڑا گناہ ہے'' سیشن جج کی آواز عدالت میں گونجی۔ سیشن جج نے دونوں کے ناموں کے آگے decline لکھ دیا، ''چوری اور جوا بھی تو گناہ ہیں'' یوسف نے دل ہی دل میں دہرایا لیکن انجانے خوف سے ان الفاظ کو زبان پر نہ لا سکا۔ یوسف اور دارا کو واپس بیرک میں بھیج دیا گیا اور بقیہ کو رہائی کے لئے کاروائی مکمل کرنے کے لئے روک لیا گیا۔ یوسف اور دارا کو جیل میں آنے کے بعد پہلی دفعہ چبھتی ہوئی تکلیف محسوس ہوئی۔ بے بسی نے ان کی امید اور ہمت نچوڑ لی تھی۔ رات اس تکلیف میں گزر گئی۔ اگلے دن یوسف کا چچا عاشق اور بھائی عمر ملاقات کے لئے جیل میں پہنچ گئے۔ ایک سپاہی یوسف اور دارا کو ملاقات کے لئے بیرک سے نکال کر ملاقاتی کمرے میں لے آیا۔ وہاں قیدی اور ملاقاتی لوہے کی جالی سے بنی دیوار سے چپٹے ہوئے تھے۔ شور اتنا زیادہ تھا کہ کسی بات کی بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ یوسف نے چچا اور بھائی کو دیکھا تو ہاتھ اٹھا کر اپنے آنے کا اشارہ کیا۔ یوسف اور دارا نے دو قیدیوں کو دھکیل کر راستہ بنایا اور پھر لوہے کی جالی سے چمٹ گئے، شرمندگی کے باعث ان کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ چچا عاشق نے دونوں کا حال دریافت کیا۔ دونوں نے ''ٹھیک'' کہہ کر جواب دیا۔ چچا نے اچانک غصہ طاری کرتے ہوئے کہا کہ تم کو شرم تو نہیں آتی؟ خاندان کی عزت خاک میں ملا دی ہے۔ اگر جیل آنا ہی تھا تو کسی شریک کی ٹانگ توڑ کر یا قتل کر کے آتے۔ یوسف کے چہرے سے شرمندگی کے

باعث پسینے کے چند قطرے پھسل کر کپڑوں میں جذب ہو گئے۔ جب چچا نے یہ حالت دیکھی تو خود ہی تسلی دیتے ہوئے کہنے لگا ''چلو کوئی بات نہیں، جیل بھی زمیندار کا زیور ہوتی ہے'' فکر نہ کرو، ضمانت دائر ہو جائے گی اور ایک دو روز بعد جیل سے نکل آؤ گے۔ یہ سن کر یوسف اور دارا کے دلوں سے ایک بڑا بوجھ اتر گیا۔

چار روز کے بعد یوسف اور دارا کی ضمانت ہو گئی اور انہیں جیل سے رہا کر دیا گیا۔ جیل کے باہر یوسف کا بھائی انہیں لینے آیا تھا۔ وہ تینوں سڑک کے کنارے چل دیئے۔ باقی زندگی لوگوں کو کہانی سنانے کے لئے یوسف کی زندگی میں بڑا واقعہ رونما ہو چکا تھا۔ دارا مسلم شیخ دونوں بھائیوں کے پیچھے چلتے غالباً یہ سوچ رہا تھا کہ ''ان کے جرم بھی ان کے اپنے نہیں ہوتے''۔

☆.....☆

ستّی

جلال حیدر اپنے کمرے میں بستر پر دبکا بیٹھا تھا۔ کچھ کہہ نہیں سکتے، سردی کی شدت کا اثر تھا کہ خوف کا۔ خوف جو کمرے کے اندر بسی خاموشی اور تنہائی کے بیچ برف کی طرح جم گیا تھا۔ جلال کی سانسوں کی تھکی آواز اس کے کانوں میں شور برپا کر رہی تھی۔ کان تو کچھ سننا نہیں چاہ رہے تھے۔ جلال کے جسم کے حصوں کا الگ الگ خوف مل کر جلال پر حاوی ہو رہا تھا۔ الگ الگ کیوں؟ خوف تو صرف دماغ میں پیدا ہوتا ہے، تو پھر دماغ نے اپنا خوف جسم کے اعضاء میں تقسیم کر دیا ہوگا۔

جلال کا پیشہ اور شوق ایک دوسرے میں پیوست تھے۔ وہ آرٹسٹ تھا۔ زندہ رہنے اور زندگی کاٹنے کا واحد سہارا اس کی وہ تصویریں تھیں جو روزی کے ساتھ، خوشی اور مقصد کا سامان مہیا کرتی تھیں۔ کینوس، برش، پینٹ کے ساتھ کپڑے ادھر ادھر بکھرے رہتے تھے۔ پرانی کتابوں کے اوراق اور کپڑوں میں بسی اس کے اپنے جسم کی مہک نے ملکر کمرے کی آب و ہوا کو باہر سے بالکل جدا کر دیا تھا۔ اس کی زندگی کے پینتالیس سال اسے ایسے لگ رہے تھے جیسے آنکھ جھپکنے کے بعد منظر ہی نیا بن گیا ہو۔ ماں باپ اور ایک بہن تو کب آنکھوں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ خون کے رشتے دار ایک غلاف تھے، جو اترنے کے بعد جلال کو ایسا لگتا تھا جیسے وہ واقعی آسمان سے نیچے گرا ہے یا پھر کسی درخت سے پیدا ہوا ہے۔ اس نے اپنی بچپن کی کہانیوں میں ایسا سنا تھا۔

یہ بچپن کی کہانیاں تو بعض اوقات حقیقت بن جاتی ہیں اور ہماری اصل زندگی محض خواب اور کینوس پر منقش تصویر محسوس ہوتی ہے۔

جلال اپنی زندگی میں تنہا تھا اور یہ تنہائی اس کے لئے راحت مہیا کرنے والی گڑیا تھی۔ وہ سب کچھ دیکھتا اور رنگوں میں بہا دیتا۔ جیسے عقل اور شعور سے محروم عمل سے اپنے آپ کو بچانا چاہ رہا ہو۔ وہ اپنی ساری شدت، غصہ اور معاشرے کی ناانصافی و بے رحمی کو رنگوں کے حوالے کر کے خود مسکرا دیتا۔ وہ کبھی کبھار تو اپنی بنائی ہوئی تصویروں سے خود ڈر جاتا۔ اس نے کبھی نہیں سوچا کہ رنگوں میں لتھڑے ہوئے اجسام اور اشیاء خود زندہ روپ دھار سکتی ہیں۔ یہ اس کے احساسات تھے جو کینوس پر تیر رہے تھے۔ احساس زندگی کی علامت ہے چاہے آسمان پر قوس قزح کی طرح چمک رہا ہو یا کسی سیاہ کوٹھڑی کے اندر ٹھٹھک رہا ہو۔ یہ خوف اور تاریکی کی حدوں سے باہر نکلنا چاہتا ہے اور تاریکی تو خود اس سے خوفزدہ ہے۔

پچیس دسمبر کی یہ رات جلال کی تنہائی کو دیو بنا رہی تھی جس کی خوفناک بدصورت شکل وقت کے غار سے آہستہ آہستہ نکل کر مکمل ہو رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے صبح ہونے تک یہ دیو اس کمرے سے نکل کر باہر کی فضاؤں پر قبضہ کر لے گا اور ہر ذی روح خوف سے اتنا ہلکا ہو جائے گی کہ ہوا میں تیرنے لگے گا۔ جلال بت بنے اپنے بستر پر بیٹھا رہا۔ رات کی تاریکی کا رنگ جب مدھم ہونے لگا تو جلال کی آنکھوں کے کواڑ بند ہو گئے اور وہ بیٹھے بیٹھے بیڈ کی ٹیک لگائے سو گیا۔ کھلی آنکھوں نے دماغ میں رنگ بدلتے خوف کو اگرچہ پلکوں کی گانٹھ کے پیچھے چھپا دیا تھا لیکن نیند نے چوری چھپے وہ گانٹھیں کھول دیں اور دیو خواب کے اندر سرایت کر گیا۔ جلال نے خواب میں دیکھا کہ اجلے ٹھنڈے دن میں مختلف رنگوں، نسلوں اور مذہبوں کے چھوٹے بڑے لوگ سرسبز زمین پر اگے ہوئے مختلف رنگوں کے پھولوں کی خوشی کو اپنے چہروں پر سجائے گھوم

رہے ہیں اور اچانک کچھ سر ہوا میں تیرنے لگتے ہیں جیسے آتش بازی ہو رہی ہو۔ ان اڑتے سروں میں موجود دماغوں نے بازوؤں کو سہارے کے لئے پھیلنے کا حکم دیا لیکن بازو تو نیچے پڑے ساکن دھڑ کے ساتھ تھے۔ خوف سے لدی ان سروں پر موجود آنکھوں نے اچانک غصے سے ایک اڑتے سر کی طرف دیکھا جو مسکرائے بھی جا رہا تھا اور ساتھ کہے جا رہا تھا کہ اب بھی راہ راست پر آ جاؤ بچ جاؤ گے۔ پھر یہ سارے سر زمین پر آ گرے اور ادھر ادھر لڑھک گئے۔ جلال کی آنکھ اچانک کھل گئی۔ اس کے دونوں ہاتھ کھڑکی سے بہتی روشنی کو روکنے کے لئے کھڑے تھے۔ ہاتھوں کے اٹھنے کا تعلق البتہ خواب سے تھا کیونکہ یہ جاگنے سے پہلے اس حالت میں تھے اور ان کا براہ راست تعلق جمال کے ماتھے پر لرزتے شبنم کے قطروں سے تھا جو اس کے جسم کے اندر سے پھوٹ پڑے تھے۔

جلال کا کمرہ مارکیٹ کی مغربی سمت پر موجود دوکانوں کے اوپر تھا۔ ان دوکانوں کے مزید مغرب کی طرف کچھ فاصلے پر وہ مشہور گراؤنڈ تھا جس کے گھاس کا رنگ پچھلے دن ہی دھماکے کے بعد سرخ ہو گیا تھا۔ اس سرخ رنگ اور اس کے اوپر سوکھی لکڑی کی طرح بکھرے جسموں کے ٹکڑوں نے جمال کے ذہن پر وہ تصویریں بنا دی تھیں جو اسے نہ سونے دیتی تھیں، نہ جاگنے دیتی تھیں۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ باہر زندگی، خوف سے تسبیح کے دانوں کی طرح سکڑ گئی ہوگی۔ وہ ڈرتے ڈرتے کمرے سے باہر نکلا اور مشرق کی طرف مارکیٹ کے دوسرے کونے کی طرف چل پڑا۔ باہر سڑک پر گاڑیوں کا ہجوم ہمیشہ کی طرح موجود تھا۔ دوکانیں کھلی ہوئی تھیں اور گاہکوں کی چہل پہل بھی برقرار تھی۔ تقریباً 300 فٹ پیدل چلنے کے بعد جمال ایک چائے کی دکان کے سامنے رک گیا۔ اسے سلطنت نیوز کے نیوز بلیٹن کے ساتھ چلنے والے میوزک کی آواز آئی تو وہ دکان کے اندر چلا گیا اور ایک میز کے اطراف پھیلی ہوئی کرسیوں میں

سے ایک پر بیٹھ کر خبریں سننے لگا۔ دھماکے میں مرنے والے اور زخمیوں کی تعداد گنوانے کے بعد نیوز کاسٹر نے کچھ سیاسی حالات و واقعات کا تذکرہ کیا۔ چائے والی اس دکان میں تقریباً نو دس افراد موجود تھے جو خبریں کم سن رہے تھے لیکن اپنے تبصرے میں زیادہ مگن تھے۔ اچانک ٹی پر ایک رپورٹ پیش کی گئی جس کے مطابق ایک ملکی انجینئر نے پانی سے گاڑی چلا دی ہے اور اس کا دعویٰ ہے کہ پٹرول کی درآمد کی کوئی ضرورت نہ ہے۔ رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا کہ اس سے قبل نیوکلیئر سائنس دان محمد بشیر نے جن سے بجلی پیدا کرنے کا فارمولا پیش کیا تھا اور اس کے مطابق اتنی بجلی پیدا کی جا سکتی ہے کہ دوسرے ملکوں کو بھی برآمد ہو سکتی ہے۔ چائے خانے میں موجود تمام افراد نے غور سے یہ رپورٹ سنی اور دعویٰ کرنے لگے کہ یہ ممکن ہے لیکن ہماری حکومت کبھی بھی اجازت نہیں دے گی۔ اسی دوران چائے خانے میں موجود دو بھاری بھر کم حضرات جو زیادہ بول رہے تھے، نے باری باری پادنا شروع کر دیا۔ جلال چائے پیئے بغیر وہاں سے اٹھ کر مارکیٹ کے درمیان چھوٹے سے لان میں پڑے بینچ پر بیٹھ گیا۔ دھوپ کی گرماہٹ سے اس کے جسم کو مزہ آنے لگا، لیکن اس کا دماغ اب بھی دھماکے کے اثرات سے آزاد نہیں ہو رہا تھا۔ دوسرے لوگ میری طرح کیوں نہیں محسوس کر رہے، یا میں ان کی طرح کیوں محسوس نہیں کر پا رہا۔ اس کی الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ چیخ کر اپنی اس تکلیف سے لوگوں کو آگاہ کرنا چاہتا تھا، لیکن آنکھیں بند کر کے اس نے ایک لمبی سانس کھینچی اور منہ کے ذریعے فضا میں لوٹا دی۔

جمال کی بے چینی اسے کہیں بیٹھنے نہیں دے رہی تھی۔ وہ بینچ سے اٹھا اور تھوڑی دیر کے لئے لان کے اندر ٹہلتا رہا۔ وہ بے خود مارکیٹ سے باہر نکلتی سڑک پر چلنے لگا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے جلے سڑے جسموں کے ٹکڑے گھوم رہے تھے اور وہ اپنے وجود سے بے پرواہ خیال کے بد کے گھوڑے پر سوار تھا۔ مارکیٹ کی حد سے باہر

نکل کر اسے اپنے وجود کا احساس ہوا جب مارکیٹ کی بیرونی دوکانوں کی چھتوں پر سیاہ اور ٹوٹی پھوٹی اینٹوں نے اسے ایک سال قبل کے دھماکے کی یاد دلادی جس میں تقریباً دوسو لوگوں کی جانیں لقمہ اجل بن گئیں اور ان کی چیخوں کی سیاہی اب بھی عمارتوں پر رنگ جمائے خاموش عکس پیدا کر رہی تھی۔

جمال تین چار روز اسی کشمکش میں جکڑا رہا کہ وہ کیسے دوسروں کی طرح ذہنی تکلیف سے چھٹکارا حاصل کرے۔ آخر ایک رات اس نے تدارک کر ہی لیا۔ روح اور ذہن کی جلن کو کینوس کے حوالے کر کے وہ اس تکلیف سے آزاد ہو جائے گا جو اس کے وجود پر آسمانی آفت کی طرح نازل ہوئی تھی۔ جلال نے ایک صبح نیند سے بیدار ہوتے ہی کینوس کو سٹینڈ پر لگایا اور برش سے کینوس کے اوپر والے حصے پر روشن نیلے آسمان کی اس طرح تعمیر کی جیسے آسمان کے ایک ٹکڑے کو کاٹ کر اس کینوس پر جوڑ دیا ہو۔ نیچے زمین گہرے سبز رنگ کے پردے میں لپٹی ہوئی بنائی گئی جس کے مختلف سوراخوں سے خون کے چشمے پھوٹ رہے تھے۔ زمین اور آسمان کے درمیان، جلال نے ہوا میں اچھلتے ہوئے دھڑ سے جدا سر بنائے جن کی آنکھوں میں خوف کا سورج چمک رہا تھا اور وہ سب ایک مسکراتے ہوئے سر کی طرف دیکھ رہے تھے۔

اگر چہ جلال کھڑے کھڑے پینٹنگ کرتے ہوئے تھک گیا تھا۔ لیکن اس کے ذہن کے ہیجان نے اس کے ہاتھوں کی انگلیوں میں اضطراب اور ہمت کو قائم رکھا۔ اس نے دوسرے کینوس پر اپنے ذہن کے ابلتے ہوئے خیالات اور احساسات کو انڈیلنا شروع کر دیا۔ اس کے ہاتھوں میں تھما ہوا برش کینوس پر ایسے چل رہا تھا جیسے پیانوں پر موسیقی پیدا کرنے والی انگلیاں دم بخود چلتی دکھائی دیتی ہیں۔ اس کینوس پر گولے دائرے کی شکل میں بیٹھے ہوئے لوگ ہیں اور منظر شاید کسی بادشاہ کے دربار کا ہے۔ دائرے کے درمیان میں ایک شخص کے دائیں ہاتھ میں تلوار ہے جبکہ دوسرے

ہاتھ نے ایک کٹے ہوئے سر کو بالوں سے تھام رکھا ہے۔ تلوار والے آدمی کے سامنے ایک کٹے سر والا آدمی کتھک ناچ ناچ رہا ہے اور دائرے میں بیٹھے لوگ کٹے سر والے شخص کی طرف ہاتھوں سے اشارے کرتے ہوئے ہنسی سے لوٹ پوٹ رہے ہیں۔
اس تصویر کو مکمل کرنے کے ساتھ ساتھ جلال زیر لب گنگنا رہا تھے۔

پہلے وہ کمیونسٹ کو لینے آئے، میں کچھ نہ بولا کیونکہ میں کمیونسٹ نہ تھا۔
پھر وہ ٹریڈ یونین والوں کو لینے آئے، میں کچھ نہ بولا کیونکہ میں ٹریڈ یونین والا نہ تھا۔
پھر وہ یہودی کو لینے آئے، میں کچھ نہ بولا کیونکہ میں یہودی نہ تھا۔
پھر وہ مجھے لینے آئے
اور میرے لئے بولنے والا کوئی بچا نہ تھا۔

تصویریں بنتی رہیں اور جلال کا کرب کم ہوتا رہا جیسے دکھ کے اظہار کے بعد دل میں ابلتا لاوا آہستہ آہستہ ٹھنڈا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

جلال نے رفتہ رفتہ کٹے ہوئے سروں کی کئی تصویریں بنا ڈالیں، ہر کٹائی اتنی اعلیٰ جیسے کاٹنے والے کی زندگی بھر کے تجربے کا امتحان ہو۔ ایسے لگتا تھا جیسے جلال کٹے ہوئے سروں کا پہاڑ بنانا چاہ رہا ہو۔

جلال نے اپنے چھوٹے سے کمرے کے اندر سمائی تنہائی میں کائنات کی وسعت کو اپنے رنگوں کے ذریعے قید کر دیا تھا۔ کائنات کی وسعت تو خیال کے سفر کا ایک سٹیشن ہے۔ جلال اپنی سوچ میں الجھا ہوا تھا کہ باہر دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو آگے اس کا دوست پروفیسر شاکر اپنے چہرے پر مسکراہٹ سجائے کھڑا تھا۔ پروفیسر شاکر لاہور آرٹ کالج میں استاد تھا اور جلال کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ وہ گاہے بگاہے جلال کو ملنے آجاتا تھا۔ جلال نے اسے کمرے میں داخل کیا اور دروازہ

بند کر کے کرسی پر پڑا ہوا تولیہ اٹھایا، اور پروفیسر شاکر بیٹھ گیا۔ کمرے کی کھڑکی کھول کر نیچے چائے والے کو آواز دی اور چائے کے ہمراہ بسکٹ لانے کا حکم نامہ جاری کیا۔ حال احوال دریافت ہوا اور پھر آرٹ پر مباحثہ شروع ہوگیا۔ جلال نے مایوسی کے عالم میں یہ کہتے ہوئے کہ جہاں موسیقی محض شور، ڈانس کلاسیکل سے بچھڑ کر صرف کود بن جائے اور Artistic Ritual of Sex سنسر ہو کر ننگا ہو جائے اور فحاشی بن جائے، وہاں آرٹ کا کیا مستقبل ہے، بحث کو ٹھکانے لگا دیا۔ اتنے میں چائے آگئی اور چائے پینے کے دوران پروفیسر شاکر کی نظر دھول سے اٹے ایک پورٹریٹ پر پڑی اور اسے کپڑے سے صاف کر کے وہ غور سے دیکھنے لگا۔ تصویر میں ایک نوجوان چند خوبصورت لمبے بالوں والے لڑکوں میں گھرا ہوا تھا اور وہ انہیں شہوانی نظروں سے دیکھ رہا تھا جبکہ کچھ فاصلے پر باریک پردے کے پیچھے کھڑی ایک عورت مسخرانہ نظروں سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ اس تصویر کے پس منظر میں جلال نے پروفیسر شاکر کو بتایا کہ خلیفہ ہارون الرشید کا بڑا بیٹا امین ہم جنس پرست تھا اور جب اس کی والدہ ملکہ زبیدہ جو بڑی ذہین تھی، کو علم ہوا تو اس نے حرم کی خوبصورت دوشیزاؤں کے بال کندھوں تک کاٹے اور ان کو مردانہ لباس زیب تن کروائے۔ تصویر میں امین کے ارد گرد جو لڑکے نظر آرہے ہیں وہ دراصل دوشیزائیں ہیں اور پردے کے پیچھے ملکہ زبیدہ ولی عہد امین کی جنسی فعلیت کو کنٹرول کرنے کے تجربے سے مطمئن نظر آتی ہے۔ جلال نے پھر رائے زنی کی کہ پراؤسٹ کے فرانس میں ایسا قبول کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔ جلال نے پروفیسر کو ہندوستان کی ملکہ نور جہاں کی بھی تصویر دکھائی جس میں وہ کاندھے پر بندوق تھامے، ایک قدم شکار زدہ شیر کے جسم پر رکھے کھڑی ہے۔

جلال کو ہارون اور جہانگیر کے حرم سے خاص لگاؤ تھا۔ ابوالحسن کی بنائی ہوئی تصویریں اس کے دماغ میں پیوست ہوگئی تھیں۔ پروفیسر شاکر نے جلال کی تصویریں

دیکھیں اور فوراً آئندہ ہفتے ہونے والی نمائش میں حصہ لینے کے لئے جلال کو راضی کرلیا۔ جلال کی تصویریں آرٹسٹوں اور صحافت سے منسلک لوگوں نے دیکھیں اور پھر کچھ دنوں بعد لاہور کرانیکلز میں ایک فیچر چھپا جس میں نہ صرف جلال کی تصویروں کو موجودہ حالات سے جوڑا گیا بلکہ عوامی بیزاری کی تصویر کشی قرار دیا گیا۔

جلال اپنی زندگی میں مگن رہا، وہ جب بھی مارکیٹ میں کھانا کھانے، خریداری کرنے یا ٹہلنے کے لئے جاتا تو اسے محسوس ہوتا جیسے چند چہرے صرف اس کی طرف متوجہ ہیں اور ہر دفعہ اِدھر اُدھر نظر آجاتے۔ کچھ دن بعد وہ باقاعدہ جلال کا پیچھا کرنے لگے۔ جلال کو جہاں حیرانی ہوئی وہاں اسے انجانے خوف کا احساس ہونے لگا۔ ایک شام جلال اپنے کمرے سے نکلا اور مارکیٹ کے عقب میں اس روڈ پر چلنا شروع ہوگیا جہاں ٹریفک اور لوگوں کی آمد و رفت بہت کم تھی۔ اچانک ایک موٹر سائیکل اس کے سامنے رکا جس پر دو آدمی سوار تھے۔ پیچھے بیٹھے شخص نے موٹر سائیکل سے اتر کر جلال کو پکڑا اور موٹر سائیکل پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ جلال نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا کیوں۔ تھانے جانا ہے، تمہارے خلاف شکایت آئی ہے، اس آدمی نے جلال کو جھنجھوڑتے ہوئے جواب دیا۔ تھانے میں جلال کو جس کمرے میں لایا گیا وہاں ایک داڑھی والا نوجوان مستغیث اسے دیکھتے ہی بولا! اچھا تو یہ صاحب ہیں۔ جلال کو اس کمرے میں اکیلے دو گھنٹے تک بند رکھا گیا اور پھر اچانک کالی وردی میں جکڑا شخص سیاہ رنگ چہرے پر ابھری ہوئی مونچھوں کے اوپر دو چھوٹی گول آنکھوں میں نفرت اور غصے کا سمندر پھیلائے اندر داخل ہوا جس کے دونوں اطراف دو فرشتے اپنے آقا کا ہر حکم ماننے کے لئے تیار کھڑے تھے۔ اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئے چھڑی کو جلال کی طرف لہراتے ہوئے وہ بولا! تم لوگ صرف ڈنڈے سے ٹھیک ہو سکتے ہو۔ جلال نے سوچا، اس ڈنڈے کے لئے ہمیشہ دوسروں کی گانڈ نظر آتی ہے۔ ایک گھنٹے بعد جب وہ

تھانہ سے اپنے کمرے میں پہنچا تو چہرے اور پیٹھ پر جمی سرخی سے اٹھتی گرم ٹیس اُس احساس کے سمندر میں ڈوبتی محسوس ہوئی جو جلال کو اپنے عزت نفس کے بکھرنے میں محسوس ہوا۔ غصہ اور بے بسی سے جلال کی زندگی ایک ڈراؤنا خواب بن گئی۔ باتھ روم میں نہاتے ہوئے اس کے آنسو پانی کے ساتھ ان دیکھی راہوں کی طرف بہہ جاتے۔ وہ کمرے کے اندر مقید ہو گیا۔ وہ باہر جانے سے ڈرتا تھا اسے یقین تھا، باہر لوگ مجمع لگائے کھڑے ہیں اور اسے دیکھ کر پیٹھ کی طرف اشارہ کریں گے اور پھر قہقہے لگائیں گے۔ تھانہ میں گرجتی آوازوں سے جلال کو معلوم ہو گیا تھا کہ خون سے ابلتی زمین اور کٹے سروں کی تصویریں اس کے جسم پر پڑے زرد نشانوں کی وجہ تھیں۔

جلال کو خوف، غصہ اور بے چینی کے اظہار کا ایک ہی طریقہ یاد تھا، جو مقدر نے اسے بخشا تھا۔ برش کو اپنے خیالوں کے رنگ میں ڈبو کر کینوس پر لکیریں کھینچنا نشہ کی طرح تھا جس سے اس نے زندگی کی پناہ تلاش کی۔ تھانہ میں بیتے حادثے کے بعد جلال بکھرے، الجھے، بے ڈھنگ درختوں اور جانوروں کا نقش گر بن گیا۔ ہواؤں پر مسلط دیو کے خوف نے جیسے ہر سانس لینے والے کو بگاڑ دیا تھا۔ اس نے کئی دفعہ خواب میں اپنے آپ کو مچھلی کی صورت بے زبان دیکھا جو پانی کے اندر کسی خوف کے آگے مسلسل بھاگ رہی ہے۔ جلال باہر چمکتی دھوپ سے لاپرواہ، اپنے کمرے کی مدھم روشنی میں کینوس کے سامنے اس طرح برش کو زور سے تھامے ہوا تھا جیسے آج وہ کینوس کھود کر تصویر بنائے گا۔ دروازے پر دستک نے اس کے جسم میں جھٹکا پیدا کیا۔ سٹینڈ پر کھڑے کینوس اور دوسری مکمل تصویروں کو جلدی سے مختلف رنگوں میں لپٹے سفید کپڑے کے نیچے چھپانے کے بعد جلال نے دروازہ کھولا۔ سامنے دو نوجوان کھڑے تھے ایک کے ہاتھ میں ڈائری جبکہ دوسرے کے ہاتھ میں چھوٹا ٹیپ ریکارڈر تھا۔ ڈائری والے نوجوان نے تعارف کروایا کہ وہ لاہور کرانیکلز اخبار کا رپورٹر ہے اور

انٹرویو کرنے آیا ہے۔ اس نے بغیر کسی وقفہ کے معذرت بھی کی کہ وہ بغیر بتائے اور وقت لیے یہاں آیا ہے کیونکہ اس کے پاس رابطے کا کوئی نمبر نہ تھا۔ جلال نے انہیں اندر آنے کی اجازت دی اور بیٹھنے کا کہا۔ جلال ابھی ان کے رپورٹر ہونے کے شک میں گرفتار تھا کہ رپورٹر نے اپنی صحافت کا کارڈ نکال کر دکھایا۔ جلال نے ایک نظر دیکھ کر مسکراتے ہوئے واپس کیا اور تکلف میں کہہ دیا کہ اس کی کیا ضرورت ہے۔ انٹرویو کے دوران جلال نے اپنے خاندان، تعلیم اور پیشہ ورانہ مشاغل کی تفصیل بیان کی۔ رپورٹر نے جب پوچھا کہ آخر خون اور جسم سے الگ سروں کو ہی اس نے اپنے آرٹ کا حصہ کیوں بنایا تو جلال نے جواب دیا کہ پھیلی ہوئی تاریکی کو جب آرٹسٹ اپنے اندر محسوس کرتا ہے تو پھر تاریکی کو وہ اپنے رنگوں سے روشن کرتا ہے۔ جلال نے اپنی بات واضح کرنے کے لئے کرد شاعر عبداللہ پشیو کی نظم ''فٹ بال'' گنگنانا شروع کر دی۔

اعلان کیا خبر رساں ایجنسیوں نے
فٹ بال میچ کا
ٹیمیں کریملین اور وائٹ ہاؤس
گیند کُرد کا سر
گول کُردستان
تماشائی دنیا، قبر کی طرح خاموش

یہ نظم گنگنانے کے بعد جلال چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گیا اور پھر خاموشی کو توڑتے ہوئے کہنے لگا ہمارے سروں سے تو ورلڈ کپ کھیلا جا رہا ہے۔

انٹرویو چھپا تو ایک کاپی جلال کو بذریعہ ڈاک موصول ہوئی۔ خوشی کے ساتھ اعتماد بڑھا، تو خوف کے سائے چھٹنے لگے۔ جلال نے پھر سے مارکیٹ میں جانا شروع کر دیا۔ کچھ دنوں بعد ہی تاریک سائے اسے اپنے پیچھے آتے دکھائی دینے لگے۔ وہ

رک کر غور سے دیکھتا تو اسے وہ سائے وہم لگے۔ وہ سائے دن بدن قریب آتے
رہے اور پھر ایک دن جلال کے کمرے کی تاریکی مستقل ہوگئی۔

پروفیسر شاکر کوئی ایک ماہ بعد جلال کو ملنے آیا تو جلال کے کمرے کے سامنے
کمرے کا مالک اور چند پولیس والے کھڑے تھے۔ کمرے کے مالک نے بتایا کہ
جلال کافی دنوں سے لاپتہ ہے اور کرایہ بھی ادا نہ کیا ہے۔ کمرے کے مالک کو جلال
کے لاپتہ ہونے کے واقعات کا علم تھا لیکن وہ چھپا رہا تھا۔ وہ کمرے کو خالی کروانے
کے لئے پولیس ملازمین کو ساتھ لایا تھا۔ غالباً اس نے کوئی رپورٹ بھی درج کروائی
تھی۔ کمرے کا تالا توڑا گیا اور سامان کی لسٹ تیار کر کے سامان مالک مکان کو بطور
امانت سونپ دیا گیا۔ پروفیسر شاکر نے جھوٹ بول کر کہ تصویریں اس نے خریدی
تھیں، کمرے کے مالک سے تکرار شروع کر دی۔ مالک نے تصویروں کو بے مقصد اور
غیر اہم گردانتے ہوئے انہیں پرورفیسر کے حوالے کر دیا۔ پروفیسر شاکر نے تصویروں
کو اکٹھا کرتے ہوئے پولیس ملازموں اور مالک کو سرگوشی کرتے سنا کہ کچھ لوگوں کے
بقول جلال کو کچھ لوگ اغواء کر کے لے گئے ہیں۔ جلال کی گمشدگی کی رپورٹ پہلے ہی
درج ہو چکی تھی اس لئے پروفیسر شاکر نے تھانہ سے رابطہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔
پروفیسر شاکر تصویریں لے کر چلا گیا۔

پروفیسر شاکر نے کچھ دن تو وہ تصویریں اپنے گھر میں رکھیں لیکن جب جلال
کے لوٹنے کی کوئی امید دکھائی نہ دی تو اس نے وہ تصویریں مال روڈ پر واقع دیال سنگھ
بلڈنگ میں اپنی چھوٹی سی آرٹ گیلری میں منتقل کر دیں جہاں پہلے ہی اس کی اپنی بنائی
ہوئی تصاویر گیلری کی دیواروں کو ٹکٹکی باندھے اپنی خوبصورتی سے لبھا رہی تھیں۔ ان
خوبصورت نظاروں کی تصاویر کے سامنے خالی دیوار پر جلال کی بنائی ہوئی تصاویر کو لٹکا
دیا گیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ان تصویروں نے زندگی کا روپ دھار لیا ہے اور ایک دوسرے

کو تجربات کی یکسانیت سے باہر نکالنے کے لئے محو حیرت میں مبتلا ہونے کے بعد سرد
گفتگو میں الجھی ہوئی ہیں۔

پروفیسر شاکر ایک دن کلاس میں لیکچر سے فارغ ہو کر طلباء کو اپنی آرٹ
گیلری دکھانے دیال سنگھ بلڈنگ پہنچا۔ اپنی بنائی ہوئی تصاویر دکھانے کے ساتھ ساتھ
پروفیسر شاکر نے آرٹ اور زندگی کے امتزاج کو لفظوں کا لباس پہنایا اور پھر جلال کی
تصاویر دکھانے سے قبل جلال کی زندگی کا اتنا تعارف طلباء کو کروایا جتنا وہ جانتا تھا۔
جلال کی بنائی ہوئی پہلی تصویر ایک درخت کی تھی جس کا موٹا تنا زمین میں گڑا ہوا تھا۔
درخت کے اوپر والے حصے پر ایک خوبصورت دوشیزہ کی تصویر دکھائی دے رہی تھی جو
اس کی شاخوں نے بنائی ہوئی تھی۔ درخت کے تنے کو ایک طفیلی پودے نے سانپ کی
کنڈلی کی صورت اپنے شکنجے میں لے رکھا تھا اور پھر یہی طفیلی پودہ بڑھتے بڑھتے اوپر
دوشیزہ کے چہرے تک پہنچ گیا تھا۔ آنکھوں کے عین نیچے طفیلی پودے کے باریک تنے
جھالر کی صورت نیچے درخت کے وسط تک گرے ہوئے تھے۔ طفیلی پودے نے گویا
قبضہ کیا ہوا تھا جس سے درخت کی اصل صورت آنکھ سے اوجھل تھی۔ دوسری تصویر میں
بادل نے ایک اژدھا کی شکل اختیار کر لی ہے جس کے پیٹ نے ڈوبتے سرخ سورج
کو اپنے پیچھے چھپا رکھا ہے اور ایسا دکھائی دیتا ہے جیسے آگ کے شعلے نکل رہے ہیں۔
آسمان پر پھیلے اژدھا نما بادل کے نیچے پرندے خوف سے لرزاں ہیں اور ان کی
جسمانی ساخت بگڑی ہوئی ہے۔ سارس کی گردن چھوٹی ہو کر اس کی لمبی ٹانگوں میں
چھپی ہوئی ہے۔ کوے ہوا کی منڈیر پر بیٹھے اپنے منہ کھولے نظر آ رہے ہیں جیسے کسی
بڑی آفت کی آمد کی اطلاع دے رہے ہوں۔ صرف کرگس فضا میں بادل کے ہمراہ
آزاد اور پر جوش نظر آ رہے ہیں جن کی نظریں زمین کی طرف لگی ہیں۔ دوسری
تصویروں میں نیے رنگ اور ٹیڑھے درخت نظر آ رہے ہیں جیسے قبرستان میں اُگے جنڈ

کے درخت جو سایہ سے زیادہ خوف کا مظہر ہوتے ہیں۔

آخری تصویر میں خواتین کا ایک جھنڈ ہے جس کے ایک طرف ملکہ زبیدہ جبکہ دوسری طرف ملکہ نور جہاں ہے۔ خواتین طفیلی پودے سے جکڑے درخت کی طرف گامزن ہیں اور درخت کی شاخوں سے بنا دوشیزہ کا مکمل خوبصورت چہرہ نظر آرہا ہے۔ طفیلی پودے کی جھالر جیسے اتر رہی ہے اور درخت کا تنا بھی کنڈلی سے آزاد ہو رہا ہے۔

پروفیسر شاکر اپنے شاگردوں کے ہمراہ آرٹ گیلری سے نکل کر باہر مال روڈ پر آیا تو تیس چالیس خواتین ہاتھوں میں اپنے لاپتہ عزیزوں کی تصاویر تھامے نعرے لگا رہی تھیں۔ اخباری رپورٹر کیمرے لئے ان کے آگے اور پیچھے چل رہے تھے۔ سڑک کے ساتھ فٹ پاتھ پر پولیس کے سپاہی ہیلمٹ پہنے، ہاتھوں میں چھڑیاں لیے ساقط کھڑے تھے، جن کے چہروں پر بے چارگی ٹپک رہی تھی۔

بازار میں خواتین کو کوسنا ابھی معاشرے نے کہاں سیکھا ہے۔ پروفیسر شاکر نے ہوا میں تیرتی لاپتہ افراد کی تصویروں کو غور سے دیکھا لیکن اسے جلال کی تصویر نظر نہ آئی، جلال نے اپنے پیچھے تکلیف سہنے کے لئے کوئی وجود نہ چھوڑا تھا۔ خواتین کا جلوس مشرق کی طرف اسمبلی ہال کی طرف گامزن تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ خواتین گھر سے ''ستی'' کا فیصلہ کر کے نکلی ہیں۔ اکیسویں صدی کی ستی جس میں عورت نے مرد کی خاطر مرنا نہیں بلکہ جینے کا فیصلہ کیا ہو۔ پروفیسر شاکر نے جلوس میں شامل ہونے کا سوچا لیکن پھر اس کے قدم مغرب میں انارکلی بازار کی طرف مڑ گئے۔

☆......☆

زینو کی شکست

ابھی سورج افق سے نمودار ہو کر گندم کے لہلہاتے پتوں پر جمی ہوئی اوس کو جذب کرنے کے لئے فاتحانہ انداز میں بل سے باہر آرہا تھا کہ شمال سے کالے بادلوں نے گرج کر اپنی آمد کی اطلاع دی۔ گاؤں کے لوگوں کو جہاں بادلوں سے رستے ہوئے پانی کا ہوا میں تیرتے ہوئے زمین پر ڈنکے کی مانند گر کر پیدا کرنے والی موسیقی ہ سوں تھا وہاں انہیں اس بات کا فکر بھی تھا کہ اگر بارش ہوگئی تو چوہدری اختر کے کتوں کی لڑائی کا انتظام درہم برہم ہو جائے گا۔ ان دنوں گاؤں کے لوگوں کی زبانوں پر کتوں اور ان کے مالکوں کے نام کا ہی ورد ہو رہا تھا۔ پچھلے کئی سالوں کے مقابلوں کی کہانیاں تاریخ کے اسباق کی طرح دہرائی جا رہی تھیں، ہر شخص نے اپنی اپنی پسند کے کتے کو ہیرو کا درجہ دے کر صورت و سیرت کے قصیدے تخلیق کر لیے تھے۔ ان حالات میں بارش تو گویا بے سرے تال کی طرح تھی۔ گاؤں میں بکھرے ہوئے لوگوں کی دھڑکنوں کے ساتھ نکلتی ہوئی واحد دعا نے بادلوں کا رخ تیز ہواؤں کی بدولت جنوب کی طرف پھیر دیا اور چند باغی قطروں نے البتہ زمین سے اپنی محبت کا اظہار کر کے خوشگوار سما باندھ دیا۔ سورج نے بادلوں سے نکل کر حیا کا پردہ چاک کیا اور لوگ گھروں سے نکل کر ٹولیوں کی شکل میں مختلف جگہوں پر اکٹھا ہونا شروع ہو گئے۔ لوگ ایک دوسرے سے لڑائی کا وقت اور کتوں کی آمد کے متعلق دریافت کر رہے تھے۔

کانوں اور زبانوں کے باہمی اشتراق سے یہ بات ہر خاص و عام کو عیاں ہو گئی کہ کچھ کتے بمع مالکان پچھلی رات کو ہی پہنچ گئے تھے اور چوہدری اختر کے ڈیرہ پر علیحدہ علیحدہ آرام کر رہے ہیں۔ بقیہ قافلوں کی آمد کا سلسلہ صبح سے جاری تھا۔

دوپہر تک لوگ اپنی یک سری مصروفیات سے عہدہ برا ہو کر کتوں کے مقابلوں سے محظوظ ہونے کے لئے تیار تھے۔ لوگ آہستہ آہستہ اس میدان کی طرف چل پڑے جہاں لڑائی کا میدان سجا تھا۔ یہ میدان گاؤں سے تقریباً ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے پر جنوب کی جانب شہر کی طرف جانے والی آثار قدیمہ کی پکی سڑک کے قریب تھا۔ سائیکل، موٹر سائیکل، گدھا گاڑیاں، پیدل چلنے والوں سے سبقت لے جانے کی خاطر بے ہموار سڑک پر ہچکولے کھا رہی تھیں۔ آس پاس کے گاؤں کے نوجوان، بوڑھے اور بچے ٹریکٹر ٹرالیوں پر بیٹھے بے الفاظ آوازیں نکال کر پیدل چلنے والوں پر اپنے جوش اور ولولے کا رعب ڈال رہے تھے اور جواب میں وہ بھی اپنے ہاتھ اُٹھانے کے ساتھ پیلوں دانتوں کو مونچھوں کے دباؤ سے آزاد کر رہے تھے۔ دور دراز شہروں اور قصبوں سے آنے والی ٹیوٹا اور ہنڈا کی بڑی بڑی گاڑیاں مختلف نسلوں اور رنگوں کے کتوں کو بٹھائے اس سڑک پر ایسے چل رہی تھیں جیسے کوئی فیری سیاحوں کو لیے ابھرتی ہوئی لہروں کے برخلاف چل رہی ہو۔

ریاض اور اللہ رکھا پیدل چلنے والوں کی صف میں شامل تھے۔ ریاض اگرچہ ان مقابلوں سے محظوظ ہوتا تھا لیکن اسے لڑنے والے کتوں کے جسم سے نکلنے والے خون کو دیکھ کر کراہت بھی محسوس ہوتی تھی۔ ہم کتوں کے ساتھ ظلم کرتے ہیں، ریاض نے اللہ رکھا کو مخاطب ہو کر کہا۔ یار مقابلے تو انسانوں میں بھی ہوتے ہیں اور یہ صرف کھیل ہے کبڈی اور باکسنگ وغیرہ کی طرح، اللہ رکھا نے جواز پیش کیا۔ انسانوں نے تو اپنے کھیلوں میں اصول وضع کیے ہیں تا کہ کھیل، کھیل ہی رہے اور جنگ کی ایسی

صورت اختیار نہ کرے جس سے نقصان کا خدشہ ہو۔ اللہ رکھا نے ریاض کی اس بات پر کچھ لمحوں کے لئے سوچا اور پھر بولا کہ جنگوں میں بھی انسان ایک دوسرے کو قتل کرتے ہیں اور وہاں تو کوئی اصول نہیں ہوتے ریاض نے اللہ رکھا کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا کہ ہر جنگ کے پیچھے یا تو کوئی مقصد ہوتا ہے یا پھر ظلم اور جبر کے خلاف دفاع کرنا ہوتا ہے، مقصد کی خاطر جان دینا بہادری کی علامت ہے۔ کتوں کی لڑائی کھیل نہیں، ظلم ہے اور اس میں ظالم صرف انسان ہیں۔

ابھی وہ باتیں کرتے جا رہے تھے کہ سامنے سے پولیس کی گاڑی آتی دکھائی دی۔ ریاض کو محسوس ہوا جیسے پولیس اس مقابلے کو روکنے آئی ہے۔ اللہ رکھا کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑنے لگا۔ ریاض نے اسے تسلی دی کہ اگر پولیس آئی ہے تو ہمیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اللہ رکھا نے خوف میں لپٹی ہوئی آواز میں کہا، تم نہیں جانتے جب جوا کھیلنے والوں پر چھاپہ پڑتا ہے تو سب سے پہلے کھڑے ہو کر دیکھنے والے ہی پکڑے جاتے ہیں۔ اگر پولیس نے لوگوں کو پکڑا تو سب سے پہلے میں ہی پکڑا جاؤں گا۔ ان دونوں کے آگے چلتے ہوئے شخص نے اپنی گردن پیچھے موڑ کر چلتے ہوئے انہیں تسلی دی کہ فکر کی کوئی ضرورت نہیں، چوہدری اختر نے پہلے ہی ڈی سی اور ایس پی سے بات کر لی ہے اور ایس ایچ او تو خود بھی لڑائی دیکھنے آ رہا ہے۔ اتنے میں پولیس کی گاڑی قریب آ گئی تھی اور اللہ رکھا نے اپنی نظریں نیچی کر لیں۔ جب گاڑی گزر گئی تو اللہ رکھا کی جان میں جان آئی۔ سامنے لڑائی کا میدان ایسے نظر آ رہا تھا جیسے کرکیشتر کا میدان ہو اور پانڈو اور کوروں کی فوجیں خیمہ زن ہوں۔

بے ہنگم ہجوم کے پاؤں سے اُٹھنے والی گرد نے ہوا میں ایسا ٹیڑھا گول دائرہ بنا دیا جیسے اس کی لکیریں تین سال کے بچے نے کورے کاغذ پر پنسل سے کھینچی ہوں۔ کچھ لوگ تو کتوں کا نظارہ کرنے کے لئے اس گول دائرے کا طواف کر رہے تھے۔

کچھ پھیری والے بھی اپنی اپنی سائیکلوں پر شکر قندی، مکئی کے بٹے، اور کینوں سجائے دائرے میں رخنہ انداز تھے۔ کچھ معززین کے لئے پنڈال کے ایک طرف کرسیاں بھی لگائی گئی تھیں جن کے نام پکارنے کے لئے لاؤڈ سپیکر کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔ تبصرہ نگار مسلسل چکوال، بہاولپور، کشمیر، اٹک، سندھ، کوہاٹ سے آئے ہوئے کتوں اور ان کے مالکان کا شجرہ نسب پکارتا جا رہا تھا اور جب تھک جاتا تو پھر میڈم نور جہاں کے پنجابی گیتوں کو ہواؤں کے سپرد کر دیتا۔

لوگوں میں اب لڑائی شروع نہ ہونے سے بے چینی بڑھ رہی تھی۔ کچھ بو ہلی اور گلٹیر کتے جب گاڑیوں سے نکال کر پنڈال کی طرف لائے گئے تو ہجوم میں ہل چل مچ گئی۔ کتوں کو دیکھ کر پیدا ہونے والے خوف سے انسانوں سے جڑا ہوا دائرہ ٹوٹا تو کچھ کتے پنڈال کے اندرونی حصے میں داخل ہوئے جن کے پیچھے رسی کے دوسرے سرے پر ملازم گھسٹتے چلے آ رہے تھے۔ مائیک پر تبصرہ نگار نے لڑائی کے باقاعدہ آغاز کا عندیہ دیا۔ میدان کی پہلی اندرونی صف زمین پر بیٹھے ہوئے لوگوں کی تھی اور اس کے پیچھے لوگ کھڑے ہو کر دادِ عیش دینے کو تیار تھے۔ میدان کے ایک طرف سے بہاولپور سے آئے ہوئے سندھی بو ہلی نسل کے کتے کو ایک آدمی میدان کے بیچ میں اس جگہ پر لا رہا تھا جہاں دو ریفری کھڑے تھے۔ دوسری طرف سے کشمیر سے آئے ہوئے بو ہلی کتے کو بھی میدان میں لایا گیا۔ جب دونوں کتوں کو بیس فٹ کے فاصلے پر ایک دوسرے کے آمنے سامنے کیا گیا تو دونوں کتے ایک دوسرے پر جھپٹنے کے لئے ایسے زور لگا رہے تھے جیسے کئی نسلوں کی دشمنی کا فیصلہ آج ہی کرنا ہو۔ دونوں کے گلے کے پٹے کیا اترے کہ بیس فٹ کا فاصلہ ایک ساعت میں طے ہو گیا۔ جبڑے کھلے اور پھر طاقت کی آزمائش شروع ہوئی۔ دونوں کی گردن اور ران کا رنگ سفید سے سرخ ہونے لگا۔ اوپر کھڑے مالکان کتوں کی پشتوں پر مسلسل ہاتھ پھیر کر ان کے نام

پکار رہے تھے۔ ان کی عزت تو گویا آج ان کتوں کے ہاتھ میں ہی تھی۔ بہاولپور کا سندھی بو ہلی تو مالک کے ہر دفعہ ہاتھ پھیرنے پر کشمیر کے کتے کو جھنجھوڑتا جواب تھک کر زبان نکالے ہانپ رہا تھا۔ کشمیری کتے نے تو ہار قبول کر لی تھی لیکن مالک اب بھی تیار نہ تھا۔ پھر اچانک ریفریوں نے بہاولپور کی فتح کا اعلان کیا تو ڈھول کی آواز گولیوں کی گونج میں پس کر رہ گئی۔ ادھر لاؤڈ سپیکر پر نغموں کی لے نے ہجوم کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس طرح کئی لڑائیاں ہوئیں جن میں کچھ کتے تو دم دبا کر بھاگے اور کچھ نے دانت دکھا کر مزید لڑائی سے انکار کیا۔

آخر میں چوہدری اختر کے کتے کو میدان میں لایا گیا۔ پچھلے تین سال کا فاتح۔ اپنی پھرتی میں بے مثال۔ طاقت اور مہارت میں یکتا۔ خوف کی علامت۔ مائیک پر تبصرہ نگار اختر کے کتے زینو کے گن گا رہا تھا۔ میدان کے اس حصے میں جہاں کرسیاں رکھی ہوئی تھیں وہاں سے نصیر بھٹی اپنے کوہاٹی نسل کے گل ٹیر کو میدان کا ایک چکر لگوا کر درمیان میں لے آیا۔ ''جنگو'' نام کے اس کتے کے کان کھڑے تھے، جن کا آدھے سے زیادہ حصہ شاید بچپن میں ہی کاٹ دیا گیا تھا۔ جسم جیسے برف کا تودہ، ناک کے نیچے ایک کالا نشان قدرت نے نظرِ بد سے بچانے کے لئے لگا دیا تھا۔ زینو نے جنگو کو دیکھ کر دم ہلائی اور اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ جنگو کی آنکھوں میں البتہ خون اترا ہوا تھا۔ جب دونوں کو ایک دوسرے کا ماس نوچنے کے لئے چھوڑا گیا تو تماشائیوں کی نظریں میدان کے مرکز پر مرتکز تھیں۔ یہ لمحہ لوگوں کے انتظار اور شوق کی انتہا کا نقطہ انجماد تھا۔ نصیر بھٹی نے ''جنگو'' کی دم کو سہلا کر زینو کی طرف چھوڑ دیا۔ دونوں کے پنجے ہوا میں اٹھے اور جنگو، زینو سے ٹکرا کر زمین پر گرا۔ زینو نے اپنے جبڑوں سے زبان نکال کر جنگو کی گردن پر پھیری۔ جنگو نے نیچے سے کبھی زینو کی گردن پر دانت گاڑھے اور کبھی ران کو دانتوں میں دبایا۔ زینو کو تو گویا لڑائی کے آداب ہی بھول گئے تھے۔ اس نے

جنگو سے لڑنے سے انکار کر دیا اور صرف بھونک کر ایک طرف ہو جاتا۔ پھر آخری دفعہ زینو نے دم پچھلی ٹانگوں میں دبا کر دانت دکھائے تو نصیر بھٹی نے فتح کا نعرہ لگایا۔ مجمع کی صفیں درہم برہم ہوئیں اور لوگ چاروں اطراف سے میدان کے درمیان پہنچ گئے۔ چاروں طرف شور مچ گیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کون جیتا ہے۔

چوھری اختر ہار ماننے پر تیار نہ تھا۔ کچھ معززین اور ریفری نے مل کر جنگو کی جیت کا اعلان کیا۔ لوگوں میں مایوسی پھیل گئی۔ ایسی لڑائی اور نتیجے کی کسی کو توقع ہی نہ تھی۔

لڑائی ختم ہوئی، دھول اپنی جگہ پر بیٹھ گئی، لوگ اپنی اپنی مصروفیات میں جت گئے۔ میدان پہلے کی طرح سنسان ہو گیا۔ سب کچھ پہلے کی طرح تھا۔

اگلے دن کے اخبار میں لڑائی کا احوال یوں درج تھا:

"گزشتہ روز مریدکے کے قریب کتوں کی سالانہ لڑائی سے محظوظ ہونے کے لئے ہزاروں لوگوں نے شرکت کی، ملک کے طول وعرض سے مختلف نسلوں کے کتے یہاں لائے گئے۔ جانوروں کے حقوق کی تنظیم اے۔ آر۔ سی نے پرزور الفاظ میں کتوں کی لڑائی کی مزمت کی ہے اور ایس۔ پی سے ملوث افراد کے خلاف کاروائی کا مطالبہ کیا ہے۔ نامہ نگار کے مطابق ایس پی نے ملوث افراد کو جلد گرفتار کرنے کے لئے متعلقہ تھانہ کے ایس ایچ او کو کاروائی کرنے کی ہدایت جاری کر دی ہے"۔

زینو کی زندگی یکسر بدل گئی، چوہدری اختر نے لڑائی کے اگلے دن ہی زینو کو بے یارو مددگار چھوڑ دیا۔ کئی سالوں کی الفت ایک شکست کی نظر ہو گئی۔ چوہدری اختر کی گاڑی کو دیکھ کر زینو نے دم ہلائی اور بھاگ کر گاڑی سے نکلے چوہدری اختر کے

جوتوں کو چاٹا اور اپنے سر کو چوہدری اختر کے ہاتھوں کے لمس کی جستجو میں آنکھیں بند کر لیں لیکن چوہدری اختر نے دھتکار کر لات رسید کی۔ پہلے دودھ اور گوشت کی بندش اور پھر روٹی کے لالے۔ زینو کی روزی اس کی فتح سے جڑی تھی، اور کسی ذریعہ کا تو اسے علم ہی نہ تھا۔ چند ہی دنوں میں گردش ایام نے اسے گلی سڑی چیزوں کے انبار لا کھڑا کیا۔ پیٹ کی آگ نے کچرے پر پلنے والا کتا بنا دیا۔

اللہ رکھا کو جب علم ہوا کہ چوہدری اختر نے زینو کو آوارہ چھوڑ دیا ہے تو وہ اسے اپنی حویلی میں لے گیا اور بھینسوں کے پاس باندھ دیا۔ دودھ اور روٹی سے اب اس کی ضیافت ہونے لگی۔ اب وہ حویلی کا راکھا تھا۔ وہی زینو جس نے ہزاروں لوگوں کو گرویدہ بنایا تھا اور بیسٹ آف ایسٹ کے لقب سے نوازا گیا تھا، آج ایک کونے میں بندھا ہوا تھا۔ رات کے روشن ستارے نے اس کونے کو دیکھ کر تبسم کیا اور اپنا رخ سینٹ ہیلنا کی طرف موڑ دیا۔

☆......☆

جنون

”محبت کا پاگل پن انسانی حیات، امنگوں کا پاگل پن سیاسی اداروں اور لالچ کا پاگل پن دولت کے لئے ضروری ہے“۔

(مشل فوکو)

گلزار بارش کے پانی سے پھیلے ہوئے جوہڑ کے کنارے جانوروں کے چارے کی ٹوٹی کھرلی کے اوپر کھڑا ہو کر پیپل کے درخت کی ایک ٹوٹی شاخ کو گاڑ رہا تھا جیسے یہ بادبان کا ستون ہو۔ وہاں سے گزرنے والے ایک ادھیڑ عمر کے آدمی نے چہرے پر ہلکی مسکراہٹ کے ختم ہونے سے قبل گلزار کو چھیڑا ”آج بحری جہاز کدھر جا رہا ہے“۔ گلزار نے غم میں ڈوبی ہوئی آواز میں جواب دیا: میں دنیا کی ساری گندم نوح کے اس جہاز میں بھر کر خدا کو واپس کرنے جا رہا ہوں اور خوشی کی دیوی کو آزاد کرواؤں گا“۔ ”احمقوں کے جہاز“ پر کھڑی پیپل کی شاخ جواب جنت کا ممنوعہ درخت لگ رہی تھی کی طرف دیکھ کر ادھیڑ عمر کے شخص نے لاحول ولاقوۃ پڑھا اور زیر لب بڑبڑایا کہ پھر پاگل پن کا دورہ پڑ گیا ہے۔

گلزار اپنے خاندان میں سب سے چھوٹا تھا۔ ماں کا لاڈلا اور تین بھائیوں کا بگ۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس نے اپنی عقل اور شعور سے خاندان کے

بڑوں کی عقل کو زبان کی ادائیگی کے بغیر پاگل پن قرار دے دیا تھا۔ وہ بچپن سے ہی انوکھا تھا۔ نئی راہوں کا متلاشی جیسے بُدھا۔ گریجویشن کے امتحان سے فارغ ہو کر اس نے لاہور کو الوداع کہا اور اپنے گاؤں کو سدھار گیا جہاں اس کی زندگی یکسر بدلنے والی تھی۔ ڈھوک سالک اب وہ گاؤں نہیں تھا جہاں اس کے بچپن میں سب لوگ ایک دوسرے کو جانتے تھے اور چند گلیوں کے راستے گاؤں کے باہر سرسبز کھیتوں میں گم ہو جاتے تھے۔ گلیاں اب بازار بن گئے تھے اور آبادی کے پھیلاؤ نے گاؤں کو ایک بڑے قصبے کی صورت جوان کر دیا تھا۔ آبادکار گھرانوں نے بھی اپنا رنگ جما لیا تھا لیکن ان کی پچھلی پیڑھی سے گاؤں کے کئی پیڑیوں کی تاریخ تھامے لوگ ناآشنا تھے۔

آبادکاروں نے بازار کی دوکانوں پر قبضہ جمایا لیکن گاؤں کے پرانے لوگ اب بھی باپ دادا کی زمینوں کو کاشت کرنے کے علاوہ کسی اور کاروبار میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ بازار میں مذہبی تہواروں کو جوش اور ولولے سے منایا جاتا۔ گلزار کو گاؤں واپس آنے کے ایک ہفتہ بعد بخار ہوا۔ گلزار دس دن تک نیم بیہوشی کی حالت میں چارپائی سے لپٹا رہا۔ بخار تو اتر گیا لیکن دماغ گم رستوں کی پناہ میں چلا گیا۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا زیادہ پڑھائی سے دماغ الٹ گیا ہے جبکہ افواہ ساز اسے بچپن میں پاگل کتے کے کاٹنے کی تاثیر قرار دیتے رہے۔ اس کے ددھیال کے رشتہ دار نانا کے پاگل پن کا حوالہ دے کر خاندانی بگاڑ کو موردِالزام ٹھہراتے۔ ادھر گلزار کو انگریزی بولنے کا خبط ہوتا تو وہ جملوں کو ذہن میں جوڑتا اور الفاظ کی آندھی منہ سے چھوڑتا، جو الفاظ نکلتے وہ کسی بھی سمجھی جانے والی زبان کے الفاظ نہ ہوتے۔ گلزار فجر کی اذان کے وقت گھر سے باہر نکل جاتا اور بندھے ہوئے جانوروں کو کھول کر مختلف سمتوں میں ہانک دیتا۔ اسے شاید جانوروں کی قید سے آزاری محسوس ہوتی تھی۔ کون کیسے جانتا ہے کہ وہ پاگل نہیں ہے۔ لوگوں کو غصہ تو آتا لیکن چپ رہتے کہ بھلا

پاگل کا کیا قصور۔ گلزار سے جب کوئی پوچھتا کہ تمہاری عمر کیا ہے تو وہ ہولڈرلن (Holderlin) کی طرح ہمیشہ کہتا چھ سال۔ وہ بزرگوں کے ہاتھ چومتا اور پھر ہاتھ باندھ کر ہندوؤں کی طرح کھڑے ہو جاتا۔ بزرگ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آگے نکل جاتے۔ گلزار کی والدہ اپنے بیٹے کی یہ حالت دیکھ کر رشتہ داروں کو کوستی کہ انہوں نے گلزار کو تعویذ ڈال دیئے ہیں۔ وہ پانچوں قل پڑھ کر بیٹے پر پھونکتی رہتی۔ پیر تغلق کے دربار پر حاضری دی، منت مانگی اور تعویذ لے کر گلزار کے گلے میں باندھا گیا۔ ماں کی منت پوری ہوئی اور کچھ دنوں بعد گلزار کے دماغ کی روشنی، روشن ہوئی۔ گلزار بیتے دنوں سے مکمل طور پر ناآشنا تھا۔ اس کا شعور انسانی عقل اور الہٰی تدبیر کے درمیان خلاء میں پرواز کے لئے سرگردان تھا اور زمینی شعور سے کٹ گیا تھا۔ گلزار کا شعور واپس زمین کی حقیقت کو چھوا تو سب پہلے کی طرح لگنے لگا۔ ماں نے پیر تغلق کے دربار پر چاول کی دیگ پکوا کر تقسیم کی اور منت پوری کی۔ گلزار اپنی زندگی میں مگن ہو گیا اور اس کی زندگی دوستوں کی ہمجولی میں گزرنے لگی۔ دوست ٹھٹھہ کرتے تو وہ ایسے ہنستا کہ ہوا کی لہروں میں موسیقی کا گمان ہوتا اور جب کبھی دنیاوی دریدہ اصولوں پر اس کا دل بجھتا تو وہ سردی سے ٹھٹھرے پتھر کی طرح آسمان پر پھیلی روشنی میں اپنے خیالوں سے جنم لینے والے سورج کو تکتا رہتا۔ لوگ اب اس کی خاموشی اور قہقہوں میں پاگل پن کو تلاش کرتے نظر آتے۔

ایک دفعہ کا پاگل ہمیشہ کا پاگل۔ گلزار نے وہ تاریخ پڑھی تھی جس سے اس کے دوست ناآشنا تھے۔ گاؤں کے عقلمند گنوار بوڑھے گاؤں کی تاریخ میں ہی زمانے کی تاریخ کا عکس دیکھتے تھے۔ ان دنوں ملک میں الیکشن کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ ہر بیٹھک اور ڈیرے پر بحثوں کا لمبا دور شروع ہوتا اور ہر کوئی نہ بدلنے والے حالات کی یکسانیت پر رائے دیتا۔ گاؤں کی تاریخ سے بات نکل کر چاروں اطراف

پھیل جاتی۔ ایسے ایک مباحثے میں گلزار نے سندھ کا ذکر آنے پر نئی توجیح پیش کر ڈالی کہ وادیٔ سندھ کے خدا تہذیب کے بکھرنے کے بعد صحراؤں میں دربدر ہو گئے اور اب تو نئے خداؤں کے فرزندان سے بچنے کی خاطر چیتھڑوں میں ملبوس مجذوب بن کر مارے مارے پھرتے ہیں۔ ان کی طاقت تو وادی سندھ کی تہذیب کے ساتھ ہی مٹی میں دفن ہو گئی تھی۔ آخر میں جب گلزار نے کہا کہ خداؤں کی طاقت اپنے ماننے والوں کی عطا ہے تو وہاں موجود لوگوں کو بات کی سمجھ تو نہ آئی البتہ وہ اس شک میں پڑ گئے کہ گلزار واقعی پاگل ہے یا جان بوجھ کر ایسا کرتا ہے۔ نارمل نے کب جانا ہے کہ حقیقت کیا ہے۔ کون کیسے جان سکتا ہے کہ وہ پاگل نہیں ہے۔ شیکسپیئر اپنے کرداروں کے سامنے اور گوئٹے نوجوان ورتھر کے سامنے کھڑے ہیں۔ کون پاگل نہیں ہے، کوئی نہیں جانتا۔

گلزار کی والدہ ایک صبح فجر کی نماز سے فارغ ہوئی تو آیتہ الکرسی کا ورد کرتے ہوئے گھر کے اطراف میں پھونکنے لگی۔ گھر کے اندرونی صحن سے متصل ڈیوڑھی میں پہنچی تو سامنے چارپائی پر بیٹھے گلزار مسکرائے جا رہا تھا۔ جب یہ مسکراہٹ اچانک قہقہے میں بدلی تو گلزار کی والدہ کے منہ سے ''ہائے'' کا لفظ خوف کے پانیوں میں غوطے لگا کر باہر نکلا۔

گلزار کا تخیل موسموں، رشتوں، اخلاقی قدروں، معاشی و سماجی درجہ بندیوں اور فکرِ دنیا سے پرواز کر کے فقط آزادی کے نخلستان میں پہنچ جاتا ہے جہاں ضرورت اور مفلسی سے آشنائی کا تصور موجود نہیں۔ ایک دن دوپہر کو گلزار قصبے کے بازار میں داخل ہوا تو اسے ایک دوکان کے سامنے ردی کے کاغذ پڑے نظر آئے۔ اس نے کچھ اوراق کی ٹیڑھی سی کشتیاں بنالیں اور تین چار ہوائی جہاز بنائے۔ اپنی شلوار کا آزار بند کھول کر شلوار کو قدموں میں پھینک دیا۔ ایک جہاز اس کے بائیں ہاتھ میں تھا جب کہ

دوسرے جہاز کو اپنے عضو تناسل کے اوپر جما دیا۔اس نے منہ سے شاں شاں کی آواز نکالی اور عضو پر کھڑے پرواز کے لئے تیار جہاز کو ہوا میں لہرا دیا اور خود اس کے پیچھے بازو پھیلائے بھاگتے ہوئے گول دائرے میں چکر لگانے لگا۔ پاؤں میں شلوار کے الجھنے سے وہ منہ کے بل زمین پر آ گرا۔اس کے ناک سے خون بہنے لگا۔قریب ہی کھڑے چند لوگوں نے اسے اٹھایا اور شلوار کو اس کے پیٹ پر باندھ دیا۔گلزار کھڑے مسکرا رہا تھا۔خون ناک سے قطروں کی صورت گریبان پر گر رہا تھا، کسی نے اس کی قمیض کے پلو سے ناک کا خون صاف کر دیا۔

بازار سے گھر پہنچنے پر گلزار کی والدہ اور بھائی پریشان ہو گئے۔ جب انہوں نے گلزار سے پوچھا کہ اسے کس نے مارا ہے تو اس نے سر کو نفی میں ہلایا۔ ماں نے اندازہ لگا لیا کہ یہ گر کر زخمی ہوا ہے۔ ماں اور بھائیوں نے اسے سمجھانا شروع کر دیا اور گلزار زمین پر نظریں گاڑے سنتا رہا۔

چند دن بعد گلزار نے ایک عجیب حرکت شروع کر دی۔ وہ دن کی روشنی میں لالٹین لے کر باہر نکلتا کہ کہیں سورج بجھ نہ جائے یا پھر آسمان میں کہیں راستہ نہ بھٹک جائے۔گلزار کے ہمسایہ لڑکے کی شادی پر موسیقی کا انتظام ہوا تو بارات سے قبل والی رات سکول کی گراؤنڈ میں سٹیج سجایا گیا۔ایک غیر معروف لیکن میٹھی سر میں گانے والے لوک گلوکار نے جب گانا شروع کیا تو سٹیج کے قریب بیٹھا گلزار ایسے لگ رہا تھا جیسے نٹشے اپنے وجد میں ویگنر (Wagner) کے سامنے بیٹھا ہو۔موسیقی کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ گلزار کا جسم ربط میں تھا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ گلزار اُٹھ کر سٹیج کے سامنے ناچنے لگا۔ چند من چلے نوجوان بھی گلزار کے ساتھ ناچنے لگے اور پھر ان کے ہاتھوں میں تھمے نوٹ اوپر ہوا میں تیرتے ہوئے زمین پر گرنے لگے۔خوشی کے اظہار میں پاگل پن کی موجودگی وقت کو روک کر وجود اور سوچ کی گہری آمیزش کو ہر چیز پر حاوی

کر دیتی ہے۔

ہر گزرتے دن کے ساتھ گلزار اپنے گرد و نواح سے ماوراء ہوتا جا رہا تھا۔ اسے سماج کے کڑے قوانین کے ادراک کی ضرورت ہی نہیں تھی۔اب وہ بازار میں گزرنے والی عورتوں کے سامنے ننگا گھومنے لگا۔عورتیں اسے دیکھ کر شرماتی مسکراہٹ کے ساتھ گزر جاتیں اور جاتے جاتے یہ فقرہ بھی کس جاتیں ''مورکھ کتنا بے شرم ہے''۔گلزار کی یہ حرکتیں جب بڑھنے لگیں تو لوگوں نے اس کے بھائیوں کو سمجھایا کہ اب اسے قابو کریں۔گلزار کی ان حرکتوں سے خاندان کی عزت داؤ پر لگ رہی تھی۔ گلزار کے بھائیوں اور والدہ نے فیصلہ کر لیا کہ گلزار کو گھر کے اندر قید کیا جائے۔نئی صدی کے اعلامیے۔ پاگلوں کو چھپا دو۔ پر عملدرآمد ہوا اور گلزار کو گھر کے اندر ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔گلزار نے کچھ گھنٹے تو خاموشی سے نکال دیئے۔لیکن پھر اس کا دماغ گھومنے لگا اور وہ کمرے کے اندر دیواروں کے ساتھ چلنے لگا۔اسے خوف محسوس ہوا کہ کہیں اس کا دماغ پھٹ نہ جائے۔ وہ محسوس کرنے لگا کہ وہ پاگل ہو جائے گا۔ پاگل کو پاگل ہو جانے کا خوف۔حقیقت وہی ہے جو سامنے ہے باقی سب فریب نظر اور خوفناک۔

گلزار نے کمرے کی قید سے آزاد ہونے کی خاطر دروازے کو زور زور سے کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔اس کی چیخیں کمرے کی دیواروں سے ٹکرا کر اس کے کانوں میں شور کرنے لگیں۔ پھر گھر والوں نے اسے چارپائی کے ساتھ ایک رسی سے باندھ دیا تا کہ وہ دیوار سے ٹکر مار کر خود کو زخمی نہ کر لے۔اس کے ماتھے پر ٹکر سے لگا زخم ابھی مندمل نہ ہوا تھا۔تنہائی، قید اور اپنوں کی پر تشدد محبت کے سامنے گلزار سرنگوں ہو کر کمرے کے اندر بے آواز بیٹھ گیا۔''اے دنیا کے پاگلو متحد ہو جاؤ''۔گلزار خاندان کی عزت پر ایک دھبہ اور خطرہ کی صورت آشکار ہوا تو گھر والوں نے اسے فاروق آباد

کے فاؤنٹین ہاؤس لے جانے کا فیصلہ کیا۔گلزار کا بڑا بھائی اسے فاؤنٹین ہاؤس ساتھ لے گیا جہاں اسے ڈھم لگائے گئے۔ وہ وہیں ''بوش'' کی پینٹنگ ''پاگل پن کا پتھر'' کی صورت ڈاکٹروں میں گھرا نظر آتا جیسے قیف سے پاگل پن کے پتھر کو سر سے نکال لیں گے اور پھر وہ حماقت کی دیوی سے آزاد ہو جائے گا۔

فاؤنٹین ہاؤس سے واپس آنے کے بعد گلزار کی عقل اس روسی کتے کی طرح تھی جو اپنی دم کو دانتوں میں دبوچنے کے لئے لٹو کی طرح گھومتا رہتا ہے۔ وہ چارپائی پر بیٹھ کر اپنے اوپر چادر ڈال لیتا ہے اور مسلسل سر کو آگے پیچھے کرتا رہتا جیسے مسجد میں بچے عربی کا قاعدہ پڑھتے ہوئے کرتے ہیں۔ دماغ نے جیسے جسمانی اعضاء کو مخالف سمتوں میں چلنے کا حکم دے رکھا تھا اور جسم بے ہنگم مشقت میں جتا ہوا تھا۔گلزار کا ذہن دو دنیاؤں میں پیوست تھا۔ ایک وہ جسے پیٹ کی آگ نے لوگوں کو باہم الجھنے اور ٹکرانے کے عمل سے دوچار کر کے تنہا کر دیا تھا اور دوسری وہ جس میں گلزار ہر ایک سے جدا ہو کر خلاء میں آزاد گھوم رہا تھا اور سب کے لئے خطرہ بن گیا تھا۔گلزار کا ذہن جب انگڑائی لے کر عام لوگوں کی طرح رہنے لگا تو پھر خاندان اور دوسرے لوگوں نے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔گلزار جنوری کی ایک صبح گھر سے نکلا۔ باہر دھند جیسے معلق تھی اور سورج کو اس دھند نے نگل لیا تھا۔گلزار اپنے منہ سے دھواں نکال نکال کر باہر فضا میں چھوڑ رہا تھا اور یہ دھواں دھند کی اڑتی سفیدی سے کھیلتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو جاتا۔

گلزار چلتے چلتے بازار کی دوکانوں کو پیچھے چھوڑ کر بازار کے آخری کونے میں پہنچ گیا۔ آگے آبادکاروں کے گھر دھند میں سر نکالے کھڑے تھے۔ بازار کی آخری دکان کے آگے ایک خالی پلاٹ تھا جس میں کوڑا کرکٹ اور کاغذ بکھرے ہوئے نظر آرہے تھے۔ پلاٹ کے سامنے گلی کی نکڑ پر کچھ جواں سال لڑکے اور دکاندار آگ جلا

کر اس کے گرد دائرہ بنائے کھڑے تھے اور ہاتھ پاؤں تاپ رہے تھے۔گلزار نے پلاٹ میں بکھرے کوڑا کرکٹ میں سے کاغذوں کی ایک تہہ کو اٹھایا اور خالی پلاٹ کی دونوں اطراف میں کھڑی عمارتوں کے کونوں کو قریب جا کر دیکھا اور پھر جیسے مایوسی کی ایک مبہم لہر اس کے چہرے پر چھا گئی۔ مایوسی کی یہ مبہم لہر اچانک سامنے کھڑے لوگوں کے درمیان ناچتی آگ کو دیکھ کر زائل ہو گئی اور گلزار آگ کے گرد تنے ہوئے دائرے کو چیر کر اندر داخل ہوا اور ہاتھ میں تھمے ہوئے کاغذوں کو آگ کی گود میں ڈال دیا۔ گلزار نے اطمینان کے سانس کا دھواں، جو چاندی جیسی رنگت کا تھا، ہوا میں تحلیل کیا اور لوگوں کی نظروں کے سامنے پھیلی ہوئی دھند میں گم ہو گیا۔ آگ نے اوراق اور ان پر پھیلی ہوئی سیاہی کو ایسے جذب کیا جیسے کائنات کی ہر چیز پر اس کی دسترس ہو۔ وہاں کھڑے لوگوں کو آگ میں گم ہوتے الفاظ عربی زبان کے محسوس ہوئے۔ اس سے پہلے کہ وہ آگ سے نکال کر دیکھتے، آگ ان الفاظ کو آسمان کی طرف پھونک چکی تھی۔ آگ کے گرد کھڑے لوگوں کی سرگوشیاں کچھ ہی دیر میں بازار میں کھلتی دوکانوں کے اندر داخل ہوئیں اور پھر غصے کی لہر نے بازار کے لوگوں کو ایک تسبیح کے دانوں کی طرح اکٹھا کر دیا۔گلزار جب اجنبی گلیوں اور راستوں سے نکل کر واپس بازار میں داخل ہوا تو سورج کی روشنی جیسے باریک کپڑے سے گزر کر لٹھے کی چادر اوڑھے صبح کو اپنی حرارت سے ٹکور رہی تھی۔گلزار کو ایک لڑکے نے پہچان لیا اور پھر اس کی پکار پر لوگ اکٹھے ہوتے گئے اور گلزار پر جھپٹے جیسے وادی سندھ کا مجذوب خدا صحرا سے بھٹک کر ادھر آ گیا ہو اور نئی سچائیوں کو جھٹلا کر اپنے وجود کا ڈوبا عکس دکھانے کی سعی کر رہا ہو۔ گلزار بازار میں مجمع کے درمیان بے بس، زخمی حالت میں پڑا ہوا تھا جب وہاں سے گزرنے والی پولیس کی گاڑی میں بیٹھے ملازمین کی منت سماجت اور دھمکیوں سے مجمع پیچھے ہٹا اور پولیس کی گاڑی گلزار کو لے کر ہسپتال چلی گئی۔گلزار ہسپتال میں بستر پر لیٹے

خوف کی بارش میں بھیگ رہا تھا جبکہ بازار میں نو آباد گھرانوں کے بچے اور بزرگ ہاتھوں میں لاٹھیاں لہراتے گلزار کی موت کا اعلان کر رہے تھے۔ بند دکانوں کے سامنے لوگ نعرے لگا رہے تھے ''مقدس اوراق کی حرمت کے لئے موت بھی قبول ہے''۔ کسی خطرے کے پیش نظر گلزار کو ہسپتال سے شہر کے تھانہ میں بند کر دیا گیا اور قصبہ کے تھانہ میں گلزار کے خلاف 295(ب) تعزیرات پاکستان کے تحت مقدمہ درج ہو گیا۔ اگلے دن سخت حفاظتی تحویل میں ملزم گلزار کو مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کرنے کے بعد، جیل منتقل کر دیا گیا۔ ایک ہفتہ میں تفتیش مکمل کر کے ملزم گلزار کے ٹرائل کے لئے چالان عدالت میں بھیج دیا گیا۔ گلزار جس دن گرفتار ہوا اس کے گھر والوں کو خبر ہو گئی، گلزار کے سب سے بڑے بھائی نے تھانہ جا کر گلزار کو ملنا چاہا لیکن گلزار وہاں نہیں تھا اور اسے اگلے دن آنے کا حکم جاری کر دیا گیا۔ اگلے دن تھانہ والوں نے اسے بتایا کہ گلزار جیل میں ہے اور ملاقات وہاں ہو سکتی ہے۔ اگلی صبح گلزار کا بھائی اور والدہ جیل پہنچ گئے اور کئی گھنٹوں کے انتظار کے بعد انہیں گلزار سے ملنے کی اجازت ملی۔ گلزار ماں کو دیکھ کر رونے لگا اور منت سماجت کرتے ہوئے ماں سے کہنے لگا مجھے یہاں جیل میں کیوں ڈلوا دیا ہے۔ مجھے ایک دفعہ اپنے ساتھ لے چلو میں کبھی آپ کو تنگ نہیں کروں گا۔ ماں اسے تسلیاں دے کر نم آنکھوں کے ساتھ واپس آ گئی۔ گلزار کے بھائی نے جیل سپرنٹنڈنٹ کو گلزار کے پاگل پن کی روداد سنائی اور پھر ماں کے ساتھ واپس گھر آ گیا۔

چودہ دن کے بعد گلزار کو عدالت میں پیش کیا گیا۔ عدالت کے اندر اور باہر پولیس کا پہرہ موجود تھا۔ چند مخصوص لوگوں کو عدالت میں داخلے کی اجازت دی گئی تھی۔ جب عدالت میں سرکار بنام گلزار کی آواز گونجی تو گلزار کا بھائی روسٹرم کے سامنے کھڑے ہو کر جج کو بتانے لگا کہ گلزار پر پاگل پن کے دورے پڑتے ہیں اور وہ

بے قصور ہے۔ جج نے جواب دیا ابھی پتہ چل جاتا ہے۔ کٹہرے میں کھڑے گلزار سے جج نے پوچھا تمہارا نام کیا ہے۔ گلزار کے لب ہلے اور ہلکی سی آواز آئی ''گلزار'' جج نے پھر پوچھا ''انسانوں کو کس نے پیدا کیا ہے''۔ گلزار نے جواب دیا ''ان کی ماؤں نے''۔ جج نے پھر سخت لہجے میں سوال کیا ''ہمارا قومی شاعر کون ہے؟'' جس پر گلزار نے عدالت میں بیٹھے لوگوں پر نظر دوڑائی اور ایک لمبے بالوں والے مولوی صاحب کو دیکھ کر اس کے منہ سے ''رابندر ناتھ ٹیگور'' کا نام نکلا جج کے لہجے میں اب تلخی نمایاں تھی، ''کون سی کتاب مکمل ضابطہ حیات ہے؟'' جج نے کرسی سے ٹیک لگاتے ہوئے پوچھا۔ گلزار نے فلسفیانہ لہجے میں ''داس کیپیٹل'' کا نام لیا اور تعریفی کلمات کی آس میں جج کی طرف دیکھنے لگا۔ جج نے گلزار کو گہری نظر سے سر تا پاؤں دیکھا اور پھر آخری سوال کیا کہ کس عظیم ہستی کے لئے تم اپنی جان قربان کر سکتے ہو۔ گلزار نے رقت آمیز لہجے میں جواب دیا ''ماں''۔ جج صاحب نے مزید سوالات کرنا مناسب نہ سمجھا اور اپنے سامنے پڑی فائل پر سوالات اور جوابات کا تذکرہ کرنے کے بعد حکم تحریر کیا کہ ملزم گلزار نہ صرف ''ذی شعور'' ہے بلکہ اپنی حرکت وسکنات سے چالاک اور عدالت کو ورغلانے والا دکھائی دیتا ہے۔ ملزم گلزار عدالتی کاروائی کو سمجھنے اور اپنا دفاع کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ گلزار کے بھائی کی طبی معائنے کی درخواست کو بھی اس حکم نامہ کے ذریعے رد کر دیا گیا۔ جج نے گلزار کو ابتدائی اطلاعی رپورٹ اور بیانات کی نقولات فراہم کرنے کے بعد سات دن بعد کی تاریخ مقرر کر دی۔ گلزار کے بھائی نے ان سات دنوں میں گلزار کے لئے وکیل کا بندوبست کرنے کے لئے کئی وکلاء کے دفتروں کے چکر لگائے لیکن کوئی وکیل بھی گلزار کا دفاع کرنے پر راضی نہ ہوا۔ سات دن بعد گلزار پر فردِ جرم لگانے کے بعد عدالت نے گلزار کے دفاع کے لئے سرکاری وکیل مقرر کر دیا۔ گواہوں کے بیانات اور جرح مکمل ہونے میں تین مہینے گزر گئے

سرکاری وکیل نے گلزار کے طبی معائنے کی نہ تو درخواست دائر کی اور نہ ہی جرح میں یہ دفاع لیا گیا۔ وکیل کو اپنی فیس سے مطلب تھا اور وہ جانتا تھا ملزم بچ نہیں پائے گا۔ گواہان نے گلزار کو آگ میں مقدس زبان کے اوراق پھینکتے دیکھا تھا اور ایسا ہی انہوں نے عدالت میں بیان دیا۔ عدالت میں موجود ملزم گلزار برف کا تودہ تھا جو پگھلتے پگھلتے بے نشان ہو گیا۔ گلزار کا عدالت میں بیان قلمبند ہوا۔ بھلا کون جان سکتا ہے کہ وہ پاگل نہیں ہے اور کوئی پاگل کیسے کہہ سکتا ہے کہ وہ پاگل ہے۔ گلزار کو عمر قید کی سزا عدالت نے سنائی اور گلزار جیل کی دیواروں کے درمیان گم ہو گیا۔ ''طاقت کو عقلمندوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو طاقت کو سمجھنے اور اس کے سامنے جھکنے سے قاصر ہے، طاقت اسے چھپا دیتی ہے''۔

جیل کے اندر قید تنہائی نے گلزار کی عقل کو آوارہ اور مفرور بنا دیا۔ اس کی ذہنی کیفیت کو دیکھتے ہوئے باقی قیدیوں سے نہ صرف علیحدہ رکھا گیا بلکہ میل جول سے بھی باز رکھا گیا۔ پہلے تو وہ ڈان کیہوٹے (Don Quixote) کی طرح بہت عرصہ پڑا رہا جو کھائی میں گر گیا تھا لیکن پھر اس کا دماغ ابلنے لگا اور اس نے چیخیں مار مار کر جیل کے عملے کو اپنے اردگرد اکٹھا کر لیا جو اسے اٹھا کر جیل کے ہسپتال میں لے گئے۔ ڈاکٹر نے بے ہوشی کا انجکشن لگایا لیکن وہ دو گھنٹوں کے بعد ہی ہوش میں آ گیا۔ اس کے شور سے تنگ آ کر دوبارہ بیرک میں منتقل کرنا پڑا۔ گلزار شور مچا کر خود ہی چپ ہو گیا۔ صبح جب قیدی کھانا لے کر آیا تو گلزار فرش پر بے ہوش پڑا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ جیل کو اطلاع دی گئی جو ڈاکٹر کے ہمراہ موقع پر پہنچ گیا۔

گلزار کے ماتھے اور سر کی پشت پر خون جما ہوا تھا۔ گریبان پر خشک خون کے دھبے موجود تھے۔ ڈاکٹر نے گلزار کا معائنہ کیا تو سانسیں ابھی چل رہی تھیں۔ گلزار کو جیل کے ہسپتال میں دو گھنٹے بعد ہوش آیا تو اسے گزشتہ رات کے واقعات یاد نہ تھے۔

سپرنٹنڈنٹ جیل نے گلزار کے خلاف اقدام خودکشی کا پرچہ درج کروا دیا۔ سماج جو خدا کا اوتار ہے وہ کیسے برداشت کرے کہ کوئی انسان اپنی جان لے سکتا ہے۔ جیل ہسپتال میں گلزار عجیب و غریب قسم کی حرکات کرنے لگا۔ کبھی وہ زور زور سے ہنسنے لگتا اور کبھی کبھار بچوں کی طرح رونا شروع کر دیتا۔ اگر کوئی اسے غصے میں جھڑکتا تو وہ سہم کر بیڈ کے پائے سے چمٹ جاتا۔

ایک ہفتہ بعد گلزار اپنے جوتوں کو سینے سے چمٹائے بیڈ کے نیچے بے حس پڑا تھا جیسے اپنی سب سے قیمتی چیز کو دنیا سے چھپانا چاہ رہا ہو۔ سپرنٹنڈنٹ جیل نے گلزار کی موت کی رپورٹ سیشن جج کو ارسال کر دی اور موت کی وجہ جاننے کے لئے مجسٹریٹ جیل میں آیا۔ گلزار کے جسم کا معائنہ کرنے، قیدیوں کے بیانات قلمبند کرنے اور گلزار کا میڈیکل چارٹ دیکھنے کے بعد مجسٹریٹ نے گلزار کو پاگل گردانتے ہوئے طبعی موت کی رپورٹ سیشن جج کو ارسال کر دی اور سپرنٹنڈنٹ جیل نے گلزار کا مردہ جسم ورثا کے حوالے کر دیا۔

☆......☆

میری کہانی

میں محکمہ ڈاک میں بطور کلرک بھرتی ہوا اور ترقی کی منازل طے کرتے کرتے پوسٹ ماسٹر بن کر اسی دفتر کے اسی کمرے میں بیٹھا ہوں، جہاں پہلے دن آ کر بیٹھا تھا۔ پرانے رشتوں کی جگہ نئے رشتوں نے لے لی ہے۔ زندگی کا تغیر آئن سٹائن کے کلیے $E=MC^2$ کی طرح ہے۔ سب کچھ بدل بھی گیا ہے اور اپنی جگہ پر موجود بھی ہے۔ دفتر کا وقت بھی میری زندگی کی روش اور اُلّو کی آواز کی طرح یکساں ہے۔ تنخواہ بڑھتی رہی لیکن بچت کا ذخیرہ ہمیشہ خالی رہا۔ زندگی گزارنے کا نہ ہی اصول سمجھ سکا اور نہ ہی زندگی کو، لیکن دوسروں نے مجھے اگلی زندگی کی حقیقت سمجھانے میں گزار دی۔

میری ملازمت کی کہانی بھی عجیب ہے۔ سکول کے دنوں میں ایک دن ماسٹر صاحب نے پوچھ لیا کہ میرا پسندیدہ مشغلہ کیا ہے؟ پرانے سکوں اور ڈاک کے ٹکٹ میں سے ایک کا انتخاب کر کے ڈاک کا ٹکٹ کہہ بیٹھا۔ بس اسی دن خدا کائنات کے باقی کام چھوڑ کر پہلی اور آخری دفعہ میری طرف متوجہ تھا اور میں تعلیم مکمل کر کے محکمہ ڈاک میں ملازم ہو گیا۔

میری ملازمت کو پچیس سال ہو گئے ہیں، دفتر کے اوقات میں تمام امور سرانجام دینے کے بعد گھر آیا تو بیوی کے افکارِ زندگی اور فکرِ معاشیات کے سامنے بس

چپ سادھ لی۔ بیوی کی آواز مَنّا ڈے کی یاد دلاتی جو مجھے کبھی بھی پسند نہ آ سکا۔ بیوی کی باتوں سے لگتا دولت، عہدہ اور جنس کے علاوہ دنیا میں رکھا ہی کیا ہے۔ صادق حیات تو ان چیزوں سے اتنا عاجز آیا کہ اس دکھ میں خودکشی کر بیٹھا۔ میں البتہ ''اندھا الو'' کے ہیرو کی طرح بیوی کے لئے کمینی، کتیا کے الفاظ کا دل ہی دل میں ورد کر کے خودکشی کو ٹالتا رہا۔

نوکری کے آخری سالوں میں جب بھی رات کو چارپائی پر لیٹتا تو نیند کمبخت نڈھال آرزو کی طرح چپ سادھ لیتی اور مجھے دور ماضی میں بکھرے وہ لوگ یاد آ جاتے جو ڈاکخانہ میں آتے تھے، لیکن اپنی خاموش کہانیوں کو بند لفافوں میں قید کر کے ڈاک خانہ کے ڈبے میں چھوڑ کر میری طرف ایسے دیکھتے جیسے کہہ رہے ہوں اس کا خیال رکھنا۔ خط ڈالنے کے بعد اتنے پرسکون ہو جاتے جیسے کوئی بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔ مجھے تو یہ سارے لوگ مصنف لگتے تھے جو اپنے دل کی آواز لفظوں کی لکیروں میں ڈبو دیتے ہیں۔ میرا دماغ خود بخود خیال کی لہروں پر چلتا رہا اور میں چارپائی پر مریض کی طرح اطراف بدلتا رہا جیسے انتہائی تکلیف میں مبتلا ہوں۔ محکمہ ڈاک نہ ہوتا تو شاید بیسویں صدی کی نثر ادھوری رہتی۔ غالب کے خطوط، فیض احمد فیض کے خطوط، ن۔م راشد کے خطوط، چرچل کے خطوط، نہرو کے خطوط، روزا لکسمبرگ کے خطوط، داوٗد رہبر کے خطوط وغیرہ۔ داوٗد رہبر کے نام سے وہ بات یاد آ گئی کہ ایک دن ن۔م راشد اور کچھ دوسرے لوگ راجندر سنگھ بیدی کے گھر میں بیٹھے تھے اور بحث چل رہی تھی کہ خدا کا وجود ہے کہ نہیں۔ بحث کے دوران بیدی کی بیوی بولی اگر خدا نہیں ہے تو پھر ٹونٹیوں میں پانی کیسے آتا ہے۔ یہ بات یاد آتے ہی میں خود بخود ہنسنے لگا اور میری بیوی نیند سے بیدار ہو گئی اور خوف سے ایسے دیکھنے لگی جیسے میں سچ مچ میں پاگل ہو گیا ہوں۔ بیوی کچھ بڑبڑا کر سو گئی تو میں پھر آنکھیں بند کر کے خیالوں میں کھو گیا اور میری

بند آنکھوں کے پیچھے نگاہِ طلسم میں مہاتما بدھ کا مجسم بغیر ناک کے دکھائی دیا۔ خطوط کے بغیر ادب۔ مجھے اچانک رمضان چوکیدار کی شکل یاد آئی جو ہر مہینے چوتھی یا پانچویں تاریخ کو منی آرڈر بھیجنے آتا اور منی آرڈر کی رقم میرے حوالے کر کے بقیہ رقم بار بار گنتا جیسے حساب لگا رہوں مہینہ کیسے گزرے گا۔

رونی بھی کیا آدمی تھا۔ اکثر ڈاک خانہ آ کر مجھے شعر سناتا اور پھر اپنی شاعری کو خطوط کے ذریعے رخت سفر کرتا اور جواب میں تعریفی کلمات کی دولت کا انتظار کرتا رہتا۔ گزرے دنوں کے خیالات کو نیند نے کب سلا دیا پتہ ہی نہ چلا اور جب آنکھ کھلی تو سورج نے اپنی آمد کا ڈھول پیٹ کر دنیا کے غریبوں کو جاگنے کا حکم سنایا۔ تیار ہوا، ناشتہ کیا اور پوسٹ ماسٹر دفتر پہنچ کر پوسٹ ماسٹر کی کرسی پر براجمان ہو گیا جس نے کئی افسروں کی پیٹھ کو سہلا سہلا کر سلا دیا تھا۔ کوئی دو گھنٹے کام کیا اور کام ختم ہو گیا۔ ماضی میں گزرے ہر سال کے ساتھ میری توانائی بھی محکمہ ڈاک کے کام اور رفتار کی طرح سکڑتی گئی۔ میرا خیال بار بار ماضی کے دشت میں پرواز کرنے لگتا۔ اس دشت میں مجھے رمضان ڈاکیا کی دھندلی سی تصویر نظر آئی۔ وہی رمضان جسے نوکری کے ابتدائی دنوں میں، میں رشک بھری نظروں سے دیکھتا تھا۔ میری نوکری بھی ٹھیک تھی لیکن مجھے رمضان ڈاکیا کی زندگی میں رومانیت دکھائی دیتی تھی۔ گھر گھر جا کر خطوں کو بے صبر لوگوں کے ہاتھوں میں تھمانا اور بند لفافوں کے اندر چھپی امید کی لہروں کو ان لوگوں کے چہروں کی سرخی میں گھلتے دیکھنا کیا تجربہ ہے۔

کیسا عجیب رشتہ ہے ڈاکیا کا۔ میرے لئے تو کوئی گیت نہیں لکھا گیا، لیکن ڈاکیا کی آمد کے انتظار کی نظمیں لوگوں کی زبان پر تھیں۔ مجھے تو بند تھیلے میں پڑے دکھوں اور سکھوں کے مختلف رنگوں کے پتھروں کو تقسیم کرنے کا شوق تھا۔ رمضان ڈاکیا خدا کی طرح دکھوں اور خوشیوں کا تقسیم کار ہے۔ رمضان لوگوں کی خوشی میں خوش ہوتا

اور لوگوں کے غموں پر آنسو بھی بہاتا۔ میں اپنی تکلیفوں سے نجات پا کر رمضان ڈاکیا جیسا خدا بننا چاہتا تھا۔ میں ڈاکیا تو نہ بن سکا البتہ ادب کا رسیا ہو گیا۔ ڈاک کی نوکری سے پیوستہ رہ کر میں نے ایک الگ خیالاتی دنیا کا سفر گھر بیٹھے بیٹھے شروع کر دیا۔ ریٹائرمنٹ کے دن قریب آتے گئے اور میں کتابوں کے براق پر سوار ساری دنیا گھوم کر واپس ابتدائے سفر ہوا۔ دفتر میں بیٹھے میں چند دنوں بعد ریٹائرمنٹ کی زندگی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ نوکری کی ریٹائرمنٹ اور زندگی کی ریٹائرمنٹ اکھٹی ہو جاتی ہے، اگر فکر حیات کا ولولہ باقی نہ رہے۔ یہ سوچ کر ہلکی سی کپکپی میرے جسم میں سے گزر گئی۔ مجھے کوئی کاروبار شروع کرنا چاہیے۔ نہیں...... فیکٹری کے اندر گدھے کی شکل کی مشینوں سے بنے لوگ یہی کرتے نظر آتے ہیں۔ اصغر سنار بھی ایسا ہی تھا۔ میدان میں چت ہونے والا پہلوان گرنے سے قبل جب آخری دفعہ زور لگاتا ہے تو جیتنے کا لالچ آخری حدوں کو چھو جاتا ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد دولت کا لالچ پہلوان کے لالچ کی طرح زندگی کے چت ہونے پر ختم ہوتا ہے۔ یہ سوچ کر کاروبار کا ارادہ انجام کو پہنچا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد زندگی کو نئے سرے سے شروع کرنے کا بھوت آج میرے سر پر سوار تھا۔ گھر گرہستی کا فکر اب بوڑھا ہو گیا تھا اور عقلمند بھی۔ بیٹیوں کی شادیاں ہو گئی تھیں اور گھر میں بیوی اور جوان بیٹا موجود تھے۔ بیٹا تعلیم مکمل کر کے اپنے مستقبل کے لئے سرگرداں تھا۔ میں نے سوچا انسان کو وہی کام کرنا چاہیے جو ہم آہنگ ہو اور خوشی دے اور ایسا کام ہی مقدر ہوتا ہے جس سے اگرچہ ہم ساری عمر بھاگتے رہتے ہیں۔ آخر میں، میں نے کتاب کی تصنیف کرنے اور ادبی سنگت کا فیصلہ کیا۔ ڈاک کے دفتر میں کرسی پر بیٹھا جسم، خیال کی نوک جھوک کے زیر اثر حیرت میں ساکن پڑا تھا کہ کئی مساجد سے اذان کی آوازوں سے جسم خیال سے آزاد ہوا۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر کی آواز حی الفلاح، حی الفلاح کی آواز سے ٹکرا رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ہر موذن لوگوں

کواپنی مسجد کی طرف کھینچنے کا جتن کرر ہا ہو۔ عصر کے اس وقت میں نے دفتر کو خیر آباد کہا اور باہر سڑک پر تھانہ اور مسجد کو پیدل عبور کر کے سرکاری گھروں کی کالونی میں داخل ہوگیا۔ گھر پہنچ کر پرانے کاغذات کو الماری سے نکالا اور چھپ کر لکھی ہوی کہانیوں کو علیحدہ کیا تو میرے ہاتھوں کی انگلیوں پر گرد ایسے جم گئی جیسے ماضی کے احساسات ہوں اور میری انگلی پکڑ کر پدرانہ شفقت کے لمس سے لطف اندوز ہونا چاہ رہے ہوں۔ ان کہانیوں کا جنم میرے ذہن میں ہوا۔ اور انہیں اپنی پہچان کے لئے میرے سہارے کی ضرورت تھی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد میں نے کچھ رقم صرف کر کے ان کہانیوں کو چھپوا دیا۔ میں اپنی ہی کہانیوں سے ڈرا ہوا تھا کہیں یہ میرے اندر کے رازوں کی آواز نہ بن جائیں اگر چہ کہانیاں لکھنے کا مقصد بھی یہی تھا۔ وظیفہ یابی کے ابتدائی دن تو یہ سوچتے گزر گئے کہ کہاں اور کس کے پاس جاؤں۔ بیوی کو دیکھ دیکھ کر یہی خیال آتا کہ اس خوش دامن سے مزاحمتی عمل میں ڈاک کی نوکری ہی میرے لئے ہومر کی اوڈیسی تھی اور یہ سفر بیوی کے دکھوں کا مداوا کرنے میں عمر بھر نا کام رہا۔ میں نے اپنے پرانے دوستوں سے میل ملاپ شروع کر دیا۔ افضل میرے سکوں کے دنوں کا دوست تھا اور اب گورنمنٹ کالج کے انگریزی شعبہ میں پروفیسر تھا۔ افضل کو ادب سے نہ صرف لگاؤ تھا بلکہ ادبی محافل میں اس کی رائے مستند تھی۔ کئی اعلیٰ پائے کے لکھاریوں کی کتابوں کے دیباچے اس کے قلم کی سیاہی سے مزین تھے۔ میں پروفیسر افضل کے گھر انہیں ملنے گیا تو وہاں سے وہ شاعر بیٹھے تھے جو اکثر ڈاکخانہ میں میرے پاس اپنی شاعری کو دستِ رسد کرنے آتے۔ بیتے دنوں کی کہانیاں سنا کر ہم نے پھر سے زندگی کے تار جوڑ لئے۔ شاعر کی غزلوں کی ستائش کے دوران ہی میں نے اپنی کہانیوں کی کتاب پروفیسر افضل کو دی اور اجازت لے کر واپس آ گیا۔ کچھ دنوں بعد پروفیسر افضل کا فون آیا کہ لاہور آرٹ کونسل میں ایک فیسٹیول منعقد ہو رہا ہے جہاں کچھ نئی کتابوں کے

تعارفی پروگرام ہیں اور میری کتاب بھی ان میں شامل ہے۔

نومبر کے آخری ہفتے کے اتوار والے دن میں بھی مال روڈ پر واقع لاہور آرٹ کونسل کے اندر داخل ہوگیا جہاں ادب کی دنیا کی بڑی بڑی ہستیاں عام لوگوں کی طرح گھوم رہی تھیں اور لوگ مرعوب جسموں کی فصیل کھڑی کر کے انہیں روک لیتے اور ان کی کتابوں کے تذکرے شروع کر دیتے۔ وہاں سب چہرے اجنبی تھے۔ اچانک میری نظر ٹیپو سلمان مخدوم پر پڑی جو نوجوانوں کے گھیرے میں کتابوں کے سٹال پر کھڑے تھے۔ میں ان کے پاس گیا تو وہ بڑے تپاک سے ملے، وہ نوجوانوں سے اردو لہجے میں پنجابی بول رہے تھے اور انہیں کتابیں پڑھنے کی ترغیب دے رہے تھے۔ کچھ نوجوانوں سے یہ پوچھنے کے بعد کہ کیا پڑھا جا رہا ہے اچانک فیصلہ کن انداز میں کہتے ''تے فیر کج لکھوناں''۔ مخدوم صاحب کو دیکھ کر مجھے یہ تسلی ہوئی کہ کوئی تو جاننے والا یہاں موجود ہے۔ مخدوم ٹیپو سلمان اردو میں افسانے تحریر کرنے کے بعد اپنی پنجاب کی ماں بولی کو بچانے کے لئے میدان میں کود پڑے تھے۔ ابھی ہم ادھر ہی کھڑے تھے کہ پروفیسر افضل کا فون آیا کہ جلدی سے ہال نمبر 3 میں پہنچ جاؤں۔ مخدوم صاحب نے بھی کسی ہال میں پنجابی تاریخ اور ادب کے مباحثے میں شرکت کرنا تھی۔ میں وہاں سے ہال نمبر 3 میں پہنچا تو پروفیسر افضل وہاں میرا انتظار کر رہے تھے جنہوں نے مجھے لاطینی امریکہ کے ادب پر مباحثے کے لئے پینل میں شامل ہونے کا بتایا۔ ہال میں 50/60 سامعین موجود تھے۔ پروگرام شروع ہوا تو پروفیسر افضل نے پینل کا تعارف کروایا۔ بحث شروع ہوئی تو سب نے گارشیا اور للوسا کے ناولوں کو ادب کے روشن مینار قرار دیا۔ سب کا خیال تھا کہ لاطینی ادب نو آبادیات کے گھن چکر سے نکل کر اپنے اصلی وجود کی تلاش میں کافی حد تک کامیاب رہا ہے۔ میں نے بھی اپنا نقطہ نظر بیان کیا کہ لاطینی امریکہ کے

ادب میں کورٹا سار اور رابرٹو بولا نو بیسویں اور اکیسویں صدی کی دہلیز پر اپنا اپنا پرچم لے کر کھڑے ہیں اور ان دونوں کی ''ہم جنس پرست شادی'' کے نتیجے میں ویلریا لیوسیلی جیسی مصنفہ نے پہلی دفعہ جنم لیا۔

مباحثہ ختم ہونے کے پندرہ منٹ بعد مخدوم ٹیپو سلمان پنجابیوں کی تاریخی جرأت کا جھنڈا ان لوگوں کے ذہنوں میں لہرا کر آئے جواب تک تاریخی بزدلی کے اثر تلے زندہ تھے۔ میری کہانیوں کی کتاب ''داغ داغ اجالا'' کا تعارف پروفیسر افضل نے کروایا اور ٹیپو سلمان مخدوم کی تعریف سے دوستی کی بو واضح پھیلتی محسوس ہوئی۔ میں اپنے تعارف میں یہ کہہ پایا کہ میں ایک ڈاکیا ہوں جو خوشیوں اور غموں کا سندیس لے کر بازاروں اور گلیوں میں ان کے موجود اور ناموجود ٹھکانوں پر پہنچانے آیا ہوں۔

شام کو میں جب گھر واپس آیا تو بیوی میرے کھلے چہرے کو دیکھ کر کچھ ناتواں سی ہوگئی میں نے اسے اپنی کتاب کے تعارفی پروگرام کا بتایا تو اس نے جہنم سے ادھار لئے سیاہ الفاظ میں کہا ''میں تو تب مانوں جب لاکھوں کی رقم میری ہتھیلی پر آئے'' یہ سن کر مجھے پھر ''اندھا الو'' کی یاد آ گئی اور میں کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کیے خیالوں میں ڈاکیا آیا، ڈاک لایا گنگنانے لگا۔

☆......☆

کراہت

دلاور اپنے گاؤں کے جوانوں میں ظاہری شکل و شباہت، قد اور چال ڈھال سے منفرد لگتا تھا۔ جوانی تو گویا بے مثل تھی اور اس عمر کا غرور اور نشہ آنکھوں اور جسم کے بقیہ خطوط سے صاف عیاں تھا۔ اس جوانی میں وہ اپنی طاقت سے ناواقف نہ تھا جو ہمیشہ ناقابل تسخیر لگتی ہے۔ اس کا چھوٹا بھائی عمر 14-13 سال کا تھا۔ اور اس کے لئے دلاور کا ہونا خود اعتمادی کی علامت تھی۔ دلاور اپنے چھوٹے بھائی سے پیار کرتا تھا لیکن ظاہر اس وقت کرتا جب چھوٹے بھائی کو کوئی تکلیف ہوتی۔

عمر کے دوستوں اور ہم جماعت لڑکوں کے دلوں میں دلاور کی شخصیت کا رعب و دبدبہ موجود تھا اس لئے لفظی لڑائی کبھی ہاتھا پائی تک نہ پہنچی۔ شام کو گاؤں میں والی بال کھیلا جاتا جہاں دلاور اچھے کھلاڑیوں میں گنا جاتا۔ ایک دن والی بال کھیلنے کے بعد دلاور اور بقیہ لوگ میدان سے گاؤں کی طرف جا رہے تھے کہ راستے میں ایک جگہ پر کافی بھیڑ تھی۔ دلاور جب بھیڑ کے قریب پہنچا تو کسی نے بتایا کہ تمہارا بھائی عمر سائیکل سے گر کر زخمی ہو گیا ہے۔ دلاور جلدی سے اپنے بھائی کی طرف گیا، جس کے سر سے خون ابل رہا تھا۔ دلاور اسے اٹھا کر جلدی سے ڈسپنسری لے گیا۔ جہاں ڈاکٹر نے زخم کو صاف کیا لیکن خون نکلنا بند نہ ہوا۔ ڈاکٹر نے جلدی سے انجکشن لگایا اور زخم دوائی میں ڈوبی روئی سے صاف کیا اور جلدی جلدی سے ٹانکے لگانے کا

کام شروع کر دیا۔ گہرے سرخ خون سے لپٹی ہوئی جلد میں سوئی کے داخل ہونے کے ساتھ ہی دلاور کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ اسے اپنے جسم کی طاقت ختم ہوتی ہوئی نظر آئی۔ وہ جلدی سے ڈسپنسری سے باہر آ گیا۔ اور اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا لیکن دل تو جیسے منہ کے راستے باہر آنے کو تیار تھا دلاور کو اندر ہی اندر شرم محسوس ہوئی اور اس نے اپنے چاروں طرف دیکھا اور لوگوں کی عدم موجودگی سے اسے کچھ ہمت آئی۔ عمر کی طاقت اس کا بھائی دلاور تھا اور دلاور کے لئے عمر کمزوری تھا۔

کچھ ہی دنوں میں عمر کے سر کا زخم بھر گیا لیکن اس زخم نے دلاور کے دل میں چھپی الفت کو بیج کے اندر موجود پودے کی طرح ظاہر کر دیا جس کا خود دلاور کو بھی علم نہ تھا۔ دلاور کے گاؤں میں چوہدری عمران، دلاور کی برادری سے ہے لیکن کئی دہائیوں سے ان کے تعلقات اچھے نہ تھے جس کی جڑیں باپ دادا کی قبروں سے جڑی تھیں۔ اگرچہ پرانے زخم وقت کی دھول میں پوشیدہ ہو گئے تھے لیکن ماضی کی کسک پرانے کھنڈرات کی طرح کہیں موجود تھی۔ دلاور کا بھائی عمر ایک دن اپنے چند دوستوں کے ساتھ گاؤں سے باہر شکار کرنے گیا۔ گاؤں سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر چوہدری عمران کے ڈیرہ کے قریب ہی درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ جہاں مختلف نوع کے پرندے موجود رہتے تھے۔ عمر نے جنگلی کبوتروں کے ایک جھنڈ پر 12 بور گن سے نشانہ لیا اور فائر سے چند کبوتر زخمی ہو کر عمران کے ڈیرہ کے سامنے آ گرے۔ ادھر عمر اور اس کا ایک دوست بھاگتے ہوئے آئے تو عمران بھی وہاں پہنچ گیا۔ کسان کا اپنی زمین پر موجود ہونا بادشاہ کا اپنی سلطنت میں موجود ہونے کی طرح ہے اور عمران اپنی سلطنت میں اجنبیوں کو دیکھ کر کہتا ہے "بچو پرندوں کو نہیں مارتے اور اگر مارنا ہے تو کہیں اور جا کر" عمر نے جواب دیا کہ پرندے کسی کی ملکیت نہیں۔ عمران کے چہرے پر خفگی کے آثار

گویا جم کر رہ گئے اور اس نے تڑپتے کبوتروں کو پروں سے اٹھایا اور جونہی واپسی کا رخ کیا تو عمر نے غصے اور شکایت سے لبریز آواز میں عمران کو آواز دی، ہمارا شکار ادھر چھوڑ دو، عمران نے جواب دیا کہ نہیں دیتا، کیا کر لو گے۔ میں بھی دیکھتا ہوں کیسے واپس نہیں کرتے۔ باتوں کی تلخی نے عمر اور عمران کو ایک دوسرے کے اتنا قریب کر دیا کہ گویا گریبان ہاتھوں میں ابھرتے ہوئے پسینے کی کشش محسوس کرنے لگے۔ عمر کے جسم میں غصے اور لڑائی کے خوف کے ملے جلے جذبات نے عارضی کپکپی پیدا کی لیکن وہ سنبھل کر کھڑا رہا۔ عمران نے اپنی جوانی اور طاقت کے غرور میں عمر کو اپنے دادا کی شجاعت یاد دلا دی، جس میں عمر کے دادا کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی اور درست حالت میں نہ جڑنے کی وجہ سے وہ آخری دم تک لنگڑا کر چلتا رہا۔

عمر اس طعنے سے اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھا۔ باتوں کی تلخی کب ہاتھا پائی تک پہنچی کسی کو علم ہی نہ ہوا۔ عمر کے دوست نے بیچ بچاؤ کرانے کی کوشش کی لیکن دھاڑتی آوازوں اور کسے ہوئے پنجوں کے وار دیکھ کر وہ پیچھے ہٹ گیا۔ عمران کا والد اور چچا دور ڈیرے سے آواز سن کر بھاگے لیکن ان کے پہنچنے سے پہلے ہی عمران نے عمر سے بندوق چھین کر سیدھا فائر کیا جو عمر کے سینے کو چیر کر دوسری طرف سے نکل گیا۔ عمر نیچے زمین پر گر گیا اور خون کا فوارہ اس کے سینے سے جاری ہو گیا۔ عمر کا دوست خوف میں وہاں سے بھاگا اور ایک دو دفعہ گرنے کے بعد گاؤں کے قریب پہنچ گیا۔ عمران کے والد اور چچا کے پہنچنے سے پہلے ہی عمر کی سانسیں بند ہو گئی تھیں۔ عمران کا غصہ اسی ساعت خوف اور بے یقینی میں بدل گیا۔ کوؤں کے شور نے کہرام برپا کر دیا اور فضا میں سوگواری، خوف، بے یقینی اور لہو کا رنگ پھیلنے لگا۔ چند ہی منٹوں میں عمر کے قتل کی خبر گھر گھر تک پہنچ گئی اور گاؤں کی زندگی اسی خبر میں منجمد ہو گئی۔ دلاور کو جب علم ہوا تو وہ اپنے دوستوں کے ساتھ اس وقت گاؤں کے قبرستان کے قریب بہت قدیم درختوں

کی چھاؤں میں تاش کھیل رہا تھا۔ خبر سنتے ہی اس کے چند لمحوں قبل قہقہے پاس کے قبرستان میں کھڑی قبروں کی مٹی میں جذب ہو گئے جن کی گونج بعد میں کبھی دلاور کے ہونٹوں سے سنائی نہ دی۔ دلاور کے پاؤں میں تو گویا بجلی دوڑ گئی اور سارا جسم پاؤں کی حرکت کی پیروی میں اس مقام کی طرف لپکا جہاں عمر کا جسم خون کی سیاہی سے رنگا ہوا تھا۔ دلاور کا چچا زاد بھائی اکرم پیچھے سے موٹر سائیکل پر آیا اور دونوں بیٹھ کر جائے وقوعہ پر پہنچے، عمر کو جلدی سے اٹھا کر درمیان میں لاد کر گاؤں لائے اور پھر ایک گاڑی میں بٹھا کر شہر لے گئے۔ ہسپتال جاتے ہی ڈاکٹروں نے عمر کو مردہ قرار دے دیا۔ پھر ہسپتال میں قانونی لوازمات جیسے پوسٹ مارٹم کے کے بعد رات کو عمر کے مردہ جسم کو دلاور واپس گاؤں لے گیا۔ اگلے دن تک گاؤں کے اوپر خوف بے یقینی اور افواہوں کا جالا بن گیا تھا۔ عمر کی والدہ کئی بار بے ہوش ہوئی اور غم نے تو اسے اپنے غلاف کے اندر قید کر لیا تھا۔ پورے گھر میں صرف دلاور ہی ہمت کی علامت تھا۔ یہ ہمت شاید عمر کی موت کو تسلیم نہ کرنے سے پیدا ہوئی تھی۔ دلاور نے جنازے کے وقت غم کی اس شدت کو محسوس کیا جو رونے پر مجبور کر دیتی ہے۔ آنسوؤں کو روکنے کی کیفیت میں اس کی سسکیاں نکلتیں لیکن اپنے اوپر صبر سے وہ آخر میں ٹھنڈی آہ میں تبدیل ہو کر رہ جاتیں۔ لیکن پھر بھی آنسو اس صبر کو توڑ کر باہر نکل آتے اور وہ لوگوں سے چھپانے کی ہر ممکن کوشش کرتا رہا۔

دسویں کے ختم کے بعد وہ اپنے چچا زاد بھائی اکرم کے ساتھ قصور چلا گیا۔ بدلے کی آگ اس کے اندر مسلسل جل رہی تھی۔ قصور میں اپنے رشتے داروں کے ہاں دو دن گزارنے کے بعد اس نے بدلہ لینے کا نہ صرف ارادہ کیا بلکہ پوری ترکیب بھی سوچ لی۔ دلاور، اکرم اور قصور کے رشتہ دار لڑکے نے اسلحہ کا انتظام کیا اور پھر دلاور اپنے چچا زاد بھائی کے ساتھ واپس چلا گیا۔ اب وہ مناسب وقت کے انتظار میں تھا

جب عمر کے قاتلوں پر ہلہ بول دیا جائے۔ ایک مہینہ یا چالیس دن کے بعد دلاور کی ہمت جواب دینے لگی اور اس کا صبر انتہائی غصے میں تبدیل ہو جاتا، جب وہ اپنے بھائی کے قاتلوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا۔ عمر کے قتل کو دو مہینے پورے ہونے میں تین دن باقی تھے کہ گاؤں کی حدود میں تین لڑکے رات کی تنہائی، خاموشی اور تاریکی کو چیرتے ہوئے داخل ہوئے۔ نومبر کی سرد راتوں میں لوگ جلد ہی اپنے لحافوں میں چلے گئے تھے اور گاؤں کے چند کتے ہی اپنی آوازوں سے نہ صرف ایک دوسرے کو جواب دے رہے تھے بلکہ گاؤں کے آباد ہونے کی نوید سنا رہے تھے۔ یہ تینوں لڑکے اپنی آمد کو ظاہر کیے بغیر آہستہ آہستہ عمران کے گھر کے قریب ہوتے گئے۔ ان تینوں کے دلوں کی دھڑکنیں تیز تھیں اور چہرے خوف، خطرے کے احساس اور بدلے کی آس سے سخت ہو گئے تھے۔ ہلکی ٹھنڈی ہوا، گرم چادروں کے اندر ان کے جسموں کو محسوس ہو رہی تھی لیکن ان کے دماغ صرف عمران کے گھر اور اس کے افراد پر مرکوز تھے۔ ان تینوں نے عمران کے گھر کی دیوار بغیر کسی سرگوشی سے پھلانگی اور چند لمحے تک گھر کے اندر دیوار کے ساتھ بیٹھ کر انتظار کیا۔ سامنے صحن کے آگے کمروں کی ایک قطار تھی اور ایک کمرے کی کھڑکی اور دروازے سے روشنی کی کرنیں چند درازوں سے بہتی ہوئی باہر نکل رہی تھیں۔ گھر کے افراد اپنے رعب کے نشہ میں یہ گمان کیے بیٹھے تھے کہ دلاور یا اس کا خاندان کبھی بھی ان کا سامنا نہ کرے گا، حملہ کرنا تو دور کی بات۔ یہ تینوں لڑکے آہستہ آہستہ صحن کو عبور کر کے اس کمرے کے قریب آ گئے، جہاں روشنی تھی۔ ان تینوں کے پاس پستول اور کاربین موجود تھیں۔ کمرے سے قہقہوں اور باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں اور یہ اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ چھ سات افراد کمرے کے اندر موجود ہیں۔ دلاور اور اس کے ساتھیوں نے کچھ دیر انتظار کیا اور پھر ہاتھوں کے اشاروں سے کمرے کے اندر داخل ہو کر حملہ کرنے کا عندیہ دیا۔ پھر تینوں بجلی کی تیزی سے کمرے کے

دروازے کو دھکا دے کر اندر داخل ہوئے اور سامنے عمران کو دیکھ کر کاربین کے فائر کھول دیے۔ چیخوں کی آواز نے تینوں کو بدحواس کر دیا اور اس بدحواسی میں کمرے کے چاروں طرف فائر کے چھرے اس طرح پھیلے جیسے شہد کی مکھیاں چھتے سے نکل کر ہوا میں ادھر ادھر اڑتی دکھائی دیتی ہیں۔ بجلی کا بلب کب ٹوٹا اور کمرے کے اندر کی روشنی اور چیخیں کب تاریکی اور خاموشی میں بدل گئیں پتہ ہی نہ چلا۔ دلاور اور اس کے ساتھی باہر کی طرف بھاگے۔ دلاور کا چچا زاد بھائی دو دفعہ زمین پر گرا اور اس کی چادر وہیں صحن میں پڑی رہی۔ دیوار پھلانگ کر وہ گلی کو عبور کر کے اس جگہ پر پہنچ گئے جہاں موٹر سائیکل کھڑے کیے تھے۔ اپنے پھولے ہوئے سانس درست کرنے کے بعد وہ ایک دوسرے سے پوچھتے رہے کہ عمران تو ہلاک ہو گیا ہوگا۔ جب بدحواسی کے سائے چھٹنے لگے تو انہیں یاد آیا کہ کمرے کے اندر اور لوگ بھی تھے اور گولیاں تو انہیں بھی لگی ہوں گی۔ ان کی موت کا سوچ کر دلاور اور اس کے ساتھیوں کے ذہنوں میں ڈر اور خوف بڑھنے لگا۔ اب نفرت کی جگہ دماغ پشیمانی سے سیراب ہونے لگا۔ پھر جلد ہی تینوں بحفاظت اپنی منزل پر پہنچ گئے۔

اس واقعہ نے پورے گاؤں کے لوگوں کے ہوش اڑا دیے۔ اس بھیانک رات کو پانچ لوگوں کا قتل ہوا۔ ایک بچہ تو اپنی ماں کے سینے سے ہی جمے ہوئے خون سے جیسے جڑ گیا ہو۔ کسی نے دلاور اور اس کے ساتھیوں کو واردات کے دوران اور بعد میں فرار ہوتے نہ دیکھا تھا۔ جنہوں نے دیکھا وہ بتانے کے لئے زندہ نہ تھے۔ دلاور کے دونوں ساتھیوں کا تو علم نہ ہو سکا لیکن دلاور پر شک تو یقین کی صورت تھا۔ دلاور اس واردات کے بعد پھر گاؤں نہ جا سکا۔ وہ اپنے والدین کی کٹی پھٹی بقیہ زندگی سے دور ویرانوں کی طرف چلا گیا جہاں زندگی کا مقصد موت سے بچنا ہی مقدر بن جاتا ہے۔ دلاور اپنا بدلہ پورا کر کے مطمئن تھا لیکن اسے دوسری اموات کا ملال بھی تھا۔

بدلہ اس نفرت کو جنم دیتا ہے جس کی موجودگی میں تمام حقیقتیں آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں اور نفرت سے سیراب ذہن اپنے عمل کے نتائج سے بھی بے پروا ہو جاتا ہے، جس کا ادارک صرف عمل کی تکمیل کے بعد ہوتا ہے۔ دلاور کی مظلومیت اس کے اپنے ظلم میں ہی تحلیل ہو گئی۔

دلاور بغیر منزل کے ہی بھاگتا رہا۔ خوف تو شکاری کتے کی طرح اپنے شکار کا پیچھا کرتا ہے۔ دلاور اپنے گاؤں سے بہت دور بھاگ جانا چاہتا تھا جہاں خوف کا سایہ اس تک نہ پہنچ سکے۔ لیکن یہ سایہ تو خون میں شامل ہو کر مسلسل دل سے دماغ تک سفر کر رہا تھا اور نتیجے میں کوڑھ جیسی بیماری جسم کو لاحق تھی، کوڑھی تو انسانوں سے دور ہی رکھے جاتے ہیں۔ دلاور کو اپنے جیسے لوگ راستوں میں ملتے رہے اور ان کے ساتھ ہی زندگی کبھی جنگل کبھی پہاڑ اور کبھی ریگستان میں بسر ہوتی رہی۔ وہ پولیس کے ریکارڈ میں اشتہاری بن چکا تھا اور ساتھ ہی سوسائٹی کا بوجھ بھی۔ اپنے خون میں بسے خوف کو وہ جرائم سے مزید پالتا رہا۔

اس نے اپنے نئے دوستوں کے ساتھ مل کر کئی راہگیروں کو لوٹا۔ روزگار کے مواقع تو کب کے کٹ گئے تھے۔ دلاور نے اپنے اس سفر میں جہاں جگہیں بدلیں وہاں اس کے دوست بھی بدلتے رہے۔ کبھی کبھی تو دلاور کو اوڈیسیس کی طرح زہرائیں بھی ملتی رہیں۔ دلاور کی زندگی ایک پتے کی طرح تھی، جو ہوا کا ساتھی بھی تھا اور اپنے جیسے کٹے پتوں کا ہمنوا بھی۔ وہ کئی بار قصور میں اپنے رشتہ داروں کے ہاں بھی رکا اور ان کے ذریعے گھر والوں کی خیریت دریافت کی اور اپنے حالات کو بھی اللہ توکل کی چادر میں اوڑھ کر پیش کرتا رہا۔ صلح کی ساری کوششیں بے سود گئیں۔ مقتولین کے ورثاء دلاور کی گرفتاری کے بعد صلح کی بات چیت پر رضامند تھے لیکن دلاور یہ خطرہ مول لینے پر تیار نہ تھا۔ دلاور بھاگتے، چھپتے مفروروں کی اس دنیا میں قدم رکھ چکا تھا

جہاں جینے اور مرنے کے اصول، عام زندگی سے میل نہ کھاتے تھے۔ یہ جنگل کی زندگی کی طرح تھی جہاں زندہ رہنے کا مقصد ہر لمحے خطرات سے آنکھ مچولی کھیلنا تھا۔ دلاور ایک دن واہگہ بارڈر کے قریب واقع گاؤں سے چار پانچ ایکڑ فاصلے پر واقع ڈیرہ پر موجود تھا کہ وہاں ایک پراپرٹی ڈیلر آیا جو ڈیرے کے رہائشی کا جاننے والا تھا۔ پراپرٹی ڈیلر کا جھگڑا اپنے پارٹنر کے ساتھ ایک دکان پر چل رہا تھا جس کی وجہ سے وہ بہت پریشان دکھائی دیتا تھا۔ ڈیرہ کے مالک نے اسے مشورہ دیا کہ تم اشتہاریوں کی بدولت قبضہ کرلو۔ پراپرٹی ڈیلر کو اس نے تسلی دی کہ کچھ اشتہاری اس کے جاننے والے ہیں۔ رہائش، کھانے اور کچھ پیسوں کا بندوبست کرلو۔ پراپرٹی ڈیلر نے کچھ دیر سوچا اور جب خیالوں میں اپنے آپ کو جھگڑے والے مکان میں موجود پایا تو ہلکی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی اور اس نے اس پروگرام پر رضامندی ظاہر کردی۔ اس نے رہائش کے بندوست کے لئے ایک دن کا وقت مانگا۔ اگلی رات کو وہ دوبارہ ڈیرہ پر آیا تو دلاور اور اس کے پانچ ساتھی، رات کے اندھیرے میں پراپرٹی ڈیلر کے ہمراہ گاؤں کے قریب نئی ہاؤسنگ سوسائٹی میں تعمیر شدہ چند گھروں میں سے ایک گھر میں داخل ہوئے۔ پراپرٹی ڈیلر انہیں وہاں چھوڑ کر چلا گیا۔ ان کے درمیان یہ طے ہوا کہ دن کے وقت قبضہ کا پورا پلان تیار کیا جائے گا۔ دلاور اور اس کے دوستوں نے رات وہاں گزاری۔ صبح ہوئی تو ایک ملازم ناشتہ لے کر آیا۔ دوپہر کو پراپرٹی ڈیلر کھانا لے کر آیا اور کھانے کے بعد قبضہ کی منصوبہ بندی مکمل ہوگئی۔ یہ فیصلہ ہوا کہ فجر کی اذان کے وقت جھگڑے والے گھر کا قبضہ لیا جائے گا۔ اس شام کو دلاور اور اس کے ہمراہی کمرے میں بچھے قالین پر دراز ٹیلی ویژن دیکھ رہے تھے۔ کمرے کے ایک کونے میں کلاشنکوف پڑی تھیں۔ دلاور اور اس کے دوست خوش گپیوں میں مشغول تھے کہ اچانک تیز قدموں کی آواز انہیں سنائی دی۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے ہتھیار اٹھاتے چار پانچ

سپاہی بندوقیں تانے کمرے کے اندر آ گئے، سپاہیوں نے کلاشنکوف دیکھیں تو فوراً دلاور اور اس کے ساتھیوں کو دیوار کے ساتھ کھڑے ہو کر بازو اوپر کرنے کا حکم دیا۔ ایک سپاہی نے سب کی تلاشی لی۔ رقم کے علاوہ ان کی جیبوں سے کچھ برآمد نہ ہوا۔ ایک پولیس افسر جس کے کاندھے پر تین پھول جڑے ہوئے تھے، نے انہیں منشیات کے بارے میں پوچھا تو دلاور نے نفی میں سر ہلایا۔ پولیس نے نشہ کے کاروبار کے انسداد کی خاطر یہ ریڈ کیا تھا۔

دلاور اور اس کے ساتھی جب پولیس کے مطلوبہ ہدف کے پورا ہونے میں کارآمد نہ ہوئے تو پولیس افسر نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ انہیں گاڑی میں ڈال کر تھانے لے چلو، وہاں طوطے کی طرح بولیں گے۔ دلاور اور اس کے ساتھیوں کو پولیس کی گاڑی میں بٹھانے کے ساتھ، کلاشنکوف، ٹی وی اور کچھ دوسرا سامان بھی قبضہ میں لے لیا گیا۔ دلاور اور اس کے ساتھیوں کو تھانہ کی حوالات میں بند کر دیا گیا۔ تھانہ میں موجود سپاہیوں میں سے ایک نے دلاور کو غور سے دیکھا اور پھر تین پھولوں والے افسر کے کان میں سرگوشی کی۔ افسر کے چہرے پر معمولی سختی کے بعد ہلکی مسکراہٹ، اس کے کندھے کے پھول کی طرح پھیلنے لگی۔ افسر نے دلاور کی طرف غور سے دیکھا اور پھر اٹھ کر حوالات کے اندر داخل ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں بید کی چھڑی تھی جسے وہ اپنی ہی ٹانگ پر آہستہ آہستہ برساتا رہا اور تفتیش میں جڑ گیا۔ دلاور اور اس کے ساتھیوں نے اپنے نام اور پتے افسر کو بتائے تو افسر کو یقین ہو گیا کہ دلاور تو وہی مجرم ہے جس کے خلاف قتل اور ڈکیتی کے بیسیوں مقدمات مختلف تھانوں میں درج ہیں اور وہ بین الاضلاعی گینگ کا سرغنہ ہے۔ دلاور البتہ اپنے نام کی اس شہرت سے ناآشنا تھا۔ اپنے گاؤں کے علاوہ اس نے کبھی کوئی گولی نہیں چلائی تھی۔ بندوق تو اس کے اپنے خوف کے خلاف مدافعانہ ہتھیار تھا جو ہر وقت اس سے جڑا رہا۔ زندگی گزارنے کے کوئی

اپنے اصول نہیں ہوتے، مقابلہ اور مخالفت ان اصولوں کے دریا کا پہلا چشمہ ہے۔

دلاور نے بے رحم موت سے بچنے کے لئے بھاگتے رہنے کا اصول اپنایا۔

پولیس افسر نے اپنے حاکم ایس پی کو اطلاع کی تو اسے انتظار کرنے کا حکم ملا۔ رات کو پولیس تھانہ کے افسر کو فیصلہ موصول ہوگیا جس کا اسے انتظار تھا۔ دلاور کو حوالات سے نکال کر پولیس کی گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ گاڑی میں چار سپاہی بندوقوں کو تھامے، دلاور کے ساتھ بیٹھ گئے۔ پولیس افسر نے ایک نوجوان اے ایس آئی کو اپنے ساتھ آنے کا کہا اور وہ گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ کوئی آدھا گھنٹہ گاڑی چلتی رہی اور پھر نہر کے کنارے ایک جگہ پر رک گئی جہاں چاروں طرف تاریکی نے سناٹا طاری کر رکھا تھا۔ دلاور کو گاڑی سے اتار کر سڑک کے کنارے کھڑا کر دیا گیا۔ تین پھولوں والے افسر نے نوجوان اے ایس آئی کو ایس پی صاحب کا حکم پورا کرنے کا کہا۔ اے ایس آئی نے ریوالور نکالا اور گاڑی کی مدہم روشنی میں دلاور کے چہرے کو دیکھا جو روئے زمین پر پھیلی امید سے عاری تھا۔ نوجوان اے ایس آئی نے ہمدردی کے جذبے کو محسوس کیا جو اس جیسے لمحات میں درد اور تکلیف کا سامان ہوتے ہیں، نوجوان اے ایس آئی کے ہاتھوں کی جنبش سے ریوالور کے منہ سے نکلتی گولیاں دلاور کے جسم میں چھید کرتی گزر گئیں۔ دلاور کے گرنے کے ساتھ ہی پولیس افسر نے وائرلیس پر پیغام دیا کہ پولیس مقابلے میں ایک ڈاکو ہلاک ہوگیا ہے جبکہ دو ڈاکو فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ نوجوان اے ایس آئی نے سرچ لائٹ میں دلاور کے جسم سے نکلے خون کو دیکھا، جسم میں ہلکی سی لرزش کے ساتھ اس نے کراہت محسوس کی اور سڑک کے کنارے قے کرنے لگا۔

☆......☆

بوجھ

سب انسپکٹر رب نواز یوں کہنے کو تو 22 سال کا وسیع تجربہ رکھتا تھا لیکن وہ ہمیشہ چھوٹے جرائم کی تفتیش میں مطلوب رہتا۔ 22 سالوں میں اس نے 150 سالوں کا پولیس نظام اپنے دماغ میں پیوست کرلیا تھا۔ وہ سمجھتا تو یہی تھا کہ پولیس تفتیش جبر اور خوف کا لامتناہی سلسلہ ہے جو انصاف کی دیوی کو مزید اندھا کرتا ہے، لیکن کسی اور طریقے پر عمل درآمد اس کی سوچ سے بالاتر تھا۔ وہ اسی طاقت اور زور سے جرم کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا جیسے ایک کسان بیلوں سے ہل چلا کر زمین سے سرسبز فصل اُگاتا ہے۔

20 اپریل، ہفتہ کا دن، سال کی گرمی اپنے لڑکپن کے دن گزار رہی تھی، صدر تھانہ کی بلڈنگ پچھلے استی سال سے اپنی انا، طاقت اور مہارت کے بوجھ تلے اپنے اوپر ہی گرنے کا انتظار کر رہی تھی۔ اس عمارت کے وسط میں ایک کمرہ دوسرے کمروں کے بیچوں بیچ پیا ہوا تھا، جہاں بجلی کا بلب دیوار کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ اس کی خاموشی میں بھی ماضی کی کچھ دردناک آوازیں تحلیل ہوگئی تھیں جو یہاں پر آنے والے مہمان کو اکثر تنہائی میں سنائی دیتی تھیں۔ اس کمرے کے ایک کونے میں چٹائی بچھی ہوئی تھی اور کچھ پرانے کاغذات بکھرے ہوئے تھے۔

رب نواز کے سامنے اسی کمرے میں آج ایک معزز ملزم بیٹھا ہوا تھا جس کو

اس کے گھر والوں نے خود ہی تھانہ میں پیش کیا تھا۔ رب نواز ایک کرسی پر جبکہ ملزم چٹائی پر بیٹھا تھا۔ ملزم پر اپنی بہن کو غیرت کے نام پر قتل کرنے کا الزام تھا اور اس الزام نے ملزم میں خوداعتمادی اور خودنمائی پیدا کر دی۔ عزت سے بڑی کوئی چیز نہیں ہے اور اس نے اپنے خاندان کی عزت ہی تو بچائی ہے۔ اس قتل کو بھی ایک چھوٹا جرم سمجھ کر تفتیش سب انسپکٹر رب نواز کے حوالے کی گئی تھی۔ فیصلے تو پہلے ہی ہو چکے تھے کہ ملزم کی بہن نے خودکشی کی ہے اور ملزم بے گناہ ہے۔ تھانہ میں ہر کوئی سمجھتا تھا کہ رب نواز کو جو کہیں گے وہ کر دے گا اور وہ بھی تھوڑے پیسوں میں۔ ملزم سے پوچھ گچھ شروع ہوئی تو اس نے وقوعہ سے لاعلمی کا اظہار کیا۔ سب انسپکٹر رب نواز نے تھرڈ ڈگری کا استعمال کر کے کچھ دیر میں ہی ساری واردات کے تہہ در تہہ چھلکے چھیل دیئے تھے اور ملزم بھی کمرے میں جیسے ادھڑا پڑا تھا۔ یہ ساری کاروائی اتنی جلدی ہوئی کہ نہ تو ایس ایچ او اور نہ ہی ڈی ایس پی کو علم ہوا۔ ملزم کو اسی تفتیشی کمرہ میں بند کر کے باہر سے کواڑ لگا دیا گیا تھا۔ رب نواز باہر تھانے کے صحن میں پڑی ہوئی چارپائی پر دراز ہو گیا۔ کوئی آدھا گھنٹہ گزرا ہو گا کہ مہتمم تھانہ اپنے دفتر میں عدالت کی پیشی بھگت کر آ گیا۔ آتے ہی اس نے اس ملزم کے بارے میں پوچھا جس کی تفتیش رب نواز کو دی گئی تھی۔ رب نواز کو بلوایا گیا۔ اس سے پہلے کہ رب نواز کو ضروری ہدایات سے آگاہ کیا جاتا اس نے ساری تفصیل مہتمم خاص کو بتا دی اور اس بات پر اترانے لگا کہ قتل کا معمہ حل ہو گیا ہے۔ تھرڈ ڈگری کا سنتے ہی مہتمم خاص کے جیسے پیروں سے زمین نکل گئی ہو۔ اس کے چہرے کی جھریوں میں پسینے کے قطرے ٹہلنے لگے تھے۔ ڈی ایس پی کو فوری طور پر فون کر کے حالات کی سنگینی سے آگاہ کیا گیا۔ دوسرے ہی لمحے رب نواز کو ڈی ایس پی صاحب کے سامنے پیش ہونے کا حکم سنایا گیا۔ رب نواز تھانہ کی بلڈنگ جیسی حالت کے موٹر سائیکل پر بیٹھ کر ڈی ایس پی کے دفتر چلا گیا جو تھانہ سے چند ایکڑ کے فاصلہ پر

تھا۔ ڈی ایس پی صاحب نے رب نواز کو غصہ میں کہا کہ تمہاری جرأت کیسے ہوئی کہ تم ایک شریف آدمی کو غیر قانونی طور پر چھترول کر کے تفتیش کرو، رب نواز نے جواب دیا سر تفتیش تو ایسے ہی ہوتی ہے۔ قتل کا معاملہ ہے۔ ڈی ایس پی کو اپنے آپ پر اور ایس ایچ او پر غصہ آیا کہ کیوں نہ پہلے رب نواز کو بتایا کہ ملزم سے پوچھ گچھ نہیں کرنی ہے۔

ڈی ایس پی نے رب نواز کو حکم دیا کہ اچھا اب اس طرح کرو کہ ضمنی میں خودکشی ظاہر کر دو اور موقع بھی ملاحظہ کر لینا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ تمہیں مل جائے گی۔ رب نواز آگے سے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے جواب دیتا ہے کہ سر ملزم نے تو اقبال جرم بھی کر لیا ہے۔ رب نواز تمہیں سمجھ نہیں آ رہی؟ ڈی ایس پی دھاڑا۔ رب نواز تمام احکامات لے کر دفتر سے باہر آیا اور اپنے کھردرے ہاتھوں کی موٹی موٹی انگلیوں سے مونچھوں کو سہلانے لگا، جیسے اس کی مونچھیں عزت نفس کے اُلجھاؤ میں بکھر گئی ہوں۔ اس نے راستے میں ہی فیصلہ کر لیا کہ وہ ہر صورت ندیم کو چالان کرے گا۔ تھانہ پہنچ کر اس نے پہلی ضمنی درج کی اور ملزم کی گرفتاری روزنامچہ میں درج کرنے کے لئے محرر کو بلوایا۔ محرر نے سارا معاملہ ایس ایچ او کو بیان کیا اور پھر یہاں سے اس عمل کی شروعات ہوئی جس میں ہر کوئی اپنے آپ کو سچا اور صحیح سمجھتا تھا۔ رب نواز کے خلاف رشوت ستانی، تھرڈ ڈگری کا استعمال اور تفتیش کے دوران غفلت برتنے کا استغاثہ تیار کیا گیا اور ڈی ایس پی سے منظور کروا کر ضلعی مہتمم جناب ایس پی صاحب کو پہنچا دیا گیا۔ رب نواز کو معطل کر کے انکوائری کا حکم دے دیا گیا۔ قتل کے مقدمہ کی تفتیش، حالات کے پیش نظر کسی دوسرے سب انسپکٹر کو سونپ دی گئی۔ کچھ دنوں بعد انکوائری شروع ہوئی اور رب نواز کے اپنے ساتھی ہی اس کے خلاف گواہ کے طور پر پیش ہوئے۔ رشوت ستانی، فرائض سے غفلت اور پر تشدد تفتیش کی وجہ سے رب نواز کو نوکری سے ہاتھ دھونا پڑا۔ رب نواز اپنے باپ سے وراثت میں ملے ہوئے گھر میں چھپ کر ناانصافی اور

جھوٹ پر مبنی زندگی کو کوسنے لگا۔

اس کا بڑا بیٹا یاسر کچھ دن قبل ہی ایل ایل بی (وکالت) کا امتحان پاس کر چکا تھا۔ ساتھ ساتھ اس نے انسپکٹر کی آسامی کے لئے تحریری امتحان پاس کر لیا تھا اور کچھ دنوں بعد اسے انٹرویو کے لئے پینل کے سامنے پیش ہونا تھا۔ انٹرویو والے دن تک سارے گھر والوں نے خوابوں کا ایک نیا جزیرہ آباد کر لیا تھا۔ بیٹا باپ سے بڑا افسر ہوگا اور وہ ترقی کر کے ایس پی بھی بن جائے گا۔ رب نواز نے بھی اپنے بیٹے کو ایس پی کی وردی پہنے تخیل میں اتار لیا تھا۔ سارے رشتہ داروں اور محلے داروں میں یہ بات عام تھی کہ یاسر انسپکٹر بن جائے گا، کیونکہ وہ بڑا ذہین ہے۔ انٹرویو والے دن باپ بیٹے کو موٹر سائیکل پر بٹھا کر اس دفتر لے گیا جہاں انٹرویو ہو رہے تھے۔ یاسر خود اعتمادی سے اندر چلا گیا۔ رب نواز دو گھنٹے تک باہر بے چینی سے انتظار کرتا رہا۔ جب یاسر واپس آیا تو اس کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا اور وہ غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا۔ انٹریو کیسا ہوا رب نواز نے پوچھا، ٹھیک ہوا ہے، یاسر نے ہلکے سے ضبط کے ساتھ جواب دیا۔ گھر پہنچ کر یاسر تو جیسے غصے اور مایوسی سے پھٹ پڑا ہو۔ مجھے انٹرویو میں فیل کر دیا ہے کہ میرا باپ ایک رشوت خور، نفسیاتی غیر ہموار انسان ہے اور اگر باپ ایسا ہے تو پھر بیٹا بھی ویسا ہی ہوگا۔ یاسر کو اپنا مستقبل ڈوبتا ہوا نظر آیا۔ رب نواز کا ماضی حال اور مستقبل بھی ہوا میں بے نام و نشان بکھر گیا۔ دو تین دن تک طعنے سننے کے بعد وہ گھر سے نکل گیا اور قریبی شہر کے ایک سستے ہوٹل کے کمرے میں بند ہو گیا۔ زمان و مکاں اور انسانوں سے وہ بیگانہ ہو گیا۔ چند دنوں بعد اس کی سانسوں کے دھاگے ٹوٹ گئے۔ موت کی وجہ دل کا فیل ہونا تھا۔

شہزاد اسلم

تقریباً دو دہائیوں سے جوڈیشل سروس سے منسلک ہیں۔ قانون کے ساتھ ساتھ ادب، تاریخ اور فلسفہ میں دِلچسپی ہے۔ تاریخِ برِّصغیر، سیاسیات اور عالمی ادب کا گہرا مُطالعہ رکھتے ہیں۔ اُصولِ قانون پر انگریزی اور اُردُو زبانوں میں کئی آرٹیکل لِکھ چُکے ہیں۔ آج کل پنجابی ناولٹ لِکھ رہے ہیں۔

لاہور • حیدر آباد • کراچی
@fictionhousepublishers www.fictionhouse.com.pk

ISBN 978-969-562-715-0